ادب اور تصوف: چالیس چراغ عشق کے اور دشتِ سوس کا تقابلی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔ فل (اردو)

مقالہ نگار

محمد سلیم سرور

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز. فیکلٹی آف لینگویجز

جنوری ۲۰۲۲ء

ادب اور تصوف: چالیس چراغ عشق کے اور دشتِ سوس کا تقابلی مطالعہ

مقالہ نگار

محمد سلیم سرور

یہ مقالہ

ایم فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان وادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، فیکلٹی آف لینگویجز

جنوری ۲۰۲۲ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگوئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **ادب اور تصوف: چالیس چراغ عشق کے اور دشتِ سوس کا تقابلی مطالعہ**

پیش کار: محمد سلیم سرور رجسٹریشن نمبرNUMLS20-17967

ماسٹر آف فلاسفی

ہیں۔ شعبہ: اردو زبان و ادب

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز ____________________

نگران مقالہ

ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ____________________

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

بریگیڈئیر سید نادر علی ____________________

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ____________

اقرار نامہ

میں، محمد سلیم سرور حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں کیا گیا تحقیقی کام میری ذاتی کاوش کا نتیجہ ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر روبینہ شہناز کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ تحقیقی کام کسی اور یونیورسٹی میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور وعدہ کرتا ہوں آئندہ کسی یونیورسٹی میں پیش کروں گا بھی نہیں۔

محمد سلیم سرور

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

Abstract

I have divided my research into four chapters entitled "Literature and Sufism: A Comparative Study of the Forty Rules of Love and Dasht-e-Soos".

In the first chapter, after the introduction of the subject, the introduction of comparative study and information regarding Sufism are presented. In addition to discussing different theories of Sufism, the boundaries and periods of Sufism have been presented. Thoughts regarding Sufism and Islam have been presented. Information regarding Sufism and Maulana Rom has been presented. Sufism and Shams Tabriz has been discussed.

In the second chapter, Elf Shafaq is introduced. The meeting of Maulana Rome and Shams Tabriz is mentioned. In this chapter, the nature of Maulana Rome is discussed with reference to the essence of Sufism. Some events from the life of Ella and A. Aziz Zahara are mentioned with reference to how the first step ofthe love is formed in to real love(Sufism). In the last part of the chapter, it is proved that the whole world becomes a link in the love of a Sufi.

Chapter 3 introduces Jamila Hashmi. In this chapter Hussain Mansoor Hallaj's early education and from the conditions of early life to the complete life of Hussain Mansoor Hallaj is presented. Hussain Bin Mansoor Hallaj, Abbas's making this a personal matter and then torturing Hussain bin Mansoor Hallaj in various ways has been examined in detail in this chapter. The hanging of Hussain bin Mansour Hallaj is mentioned in the last part of the chapter.

Chapter IV compares "Forty Rules of Love" and "Dasht-e-Sus" and examines the commonalities and differences in the novels.

اظہارِ تشکر

اللہ تعالیٰ کا جس قدر بھی شکر ادا کروں کم ہے کہ اس ذات نے مجھے زندگی، صحت اور دماغ جیسی نعمتوں سے نوازا اور ان نعمتوں کے طفیل نہ صرف یہاں تک پہنچا یا بلکہ محنت اور لگن کے ساتھ حصولِ علم کے قابل بھی بنایا۔ محسنِ کائنات کی کرم فرمائی پر ممنون ہوں جن کی سنت پر عمل کرتے ہوئے تحصیلِ علم کے لیے سر گرداں ہوں۔ میں اپنے اساتذہ کا بے حد مشکور ہوں جنھوں نے تحقیق کے گر سکھائے۔ تحقیق جیسے مشکل کام سے نبرد آزما ہوتے ہوئے جامعات کے سکالر کا گھبرا جانا ایک معمولی کام ہے مگر اس گھبراہٹ کو راحت میں بدلنے والی ماں جیسی شفیق استاد روبینہ شہناز صاحبہ کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔ ان کا سایہ ابرِ رحمت کی طرح ہر وقت میرے سر پر رہا اور میں تحقیق کی منازل آسانی سے طے کرتا گیا۔ میں اپنے اس تحقیقی سفر میں ڈاکٹر صائمہ نذیر کا بے حد ممنون ہوں جنھوں نے بہت زیادہ معاونت کی۔ ڈاکٹر عابد سیال، ڈاکٹر شفیق انجم نے میری ہر الجھن کو سلجھانے اور کوتاہی کو سدھارنے میں بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ شعبہ اردو کی شان، صدرِ شعبہ ڈاکٹر فوزیہ اسلم صاحبہ کا بھی مشکور ہوں۔ میں اپنے والدین (محمد سرور صاحب اور والدہ ماجدہ بلقیس بی بی) کا دونوں جہاں میں مقروض ہوں جو ہر لمحہ میری کامیابی کے لیے دعا گو رہتے ہیں۔ میں اپنے سب بہن بھائیوں کا مشکور ہوں جنھوں نے میرے لیے دعائیں کی اور خاص طور پر اپنی بہن شاہدہ تسنیم کا ممنون ہوں جنھوں نے دن رات میری خدمت کی۔ میں اپنی رفیقہ حیات صدف انجم کا بھی احسان مند ہوں جو دور رہتے ہوئے بھی ہر پل میرے تحقیقی کام کی خبر لیتی رہیں اور میری ڈھارس بندھاتی رہیں۔

نیشنل لائبریری، نمل لائبریری، اکادمی ادبیات لائبریری، مقتدرہ لائبریری، ایسٹران کالج لائبریری کے ذمہ داران کا مشکور ہوں اور خاص طور پر عارف حسین کا انتہائی ممنون ہوں جنہوں نے ہمیشہ کتابوں کی فراہمی کے ساتھ ساتھ نیک تمناؤں اور مفید مشوروں سے نوازا۔

میں اپنے تمام دوستوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جو ہمہ وقت مجھے یاد رکھتے ہیں اور بے لوث محبت کے بادل نچھاور کرتے ہیں۔ خاص الخاص پروفیسر ڈاکٹر سعید طیب بھٹوی صاحب کا مشکور ہوں جو میری ایک ادنیٰ سی آواز پر اصلاح کے لیے حاضر ہو جاتے ہیں۔ رشتہ داروں میں انکل عثمان کا مشکور ہوں جنہوں ہمیشہ میری معاونت کی۔ اور تحقیقی کام کے لیے لیپ ٹاپ جیسا انمول تحفہ دینے پر میں اپنی عزیزہ کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مشکور ہوں۔ عائشہ خضر کا

بھی میں مشکور ہوں جنھوں نے کتابوں کی تلاش میں حد سے زیادہ معاونت کی۔ آخر میں، میں دعا گو ہوں اللہ پاک
میرے والدین اساتذہ اور میرے دوستوں کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ آمین

باب اول:

موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

ا۔ موضوع کا تعارف

مجوزہ مقالہ ترکش ناول نگار ایلف شفق کا انگریزی زبان میں لکھا ہوا ناول "چالیس چراغ عشق کے" اور اردو زبان کی نامور ناول نویس اور افسانہ نگار جمیلہ ہاشمی کے ناول "دشتِ سوس" کا تصوف کے حوالے سے تقابلی مطالعہ پر مشتمل ہے۔ ان ناولوں میں ناول نگاروں نے تصوف کے کامل درجے تک رسائی کے لیے محبت کو بنیاد بنایا ہے اور محبت میں اس قدر طاقت رکھ دی ہے جس کو اپنا کر ایک صوفی اپنے اصل مقاصد آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔ صوفی اپنے ہر کام میں ظاہر سے زیادہ باطن سے کام لیتا ہے مگر باطن کے ان فیصلوں کو عام آنکھ دیکھنے سے قاصر ہوتی ہے عام آنکھ کو یقین دلانے کے لیے عشق اور محبت کے مادی زینوں سے کام لیا جاتا ہے۔ مجوزہ مقالے میں محبت اور تصوف کے تعلق کے حوالے سے جائزہ لیا گیا۔

"چالیس چراغ عشق کے" اور "دشتِ سوس" میں ناول نگاروں نے محبت کے پیکر کو استعمال کیا ہے اور یہ عشق اور محبت بظاہر مادی دنیا کی اوٹ میں چھپے ہوئے ہیں۔ مجوزہ مقالے میں دونوں ناول نگاروں کے مواد کا تجزیہ کرتے ہوئے اس بات کا جائزہ لیا گیا اور اس بات کا پتا لگایا گیا کہ ان مصنفین نے تصوف کے کون کون سے عناصر میں اشتراکات کا مظاہرہ کیا ہے اور کن باتوں میں دونوں کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔

بظاہر دونوں ناول نگاروں نے مختلف پیش منظر کے تحت تصوف کو مختلف کرداروں اور مختلف واقعات کے ذریعے بیان کیا ہے مگر دونوں کے ہاں بہت سی باتیں اشتراکات کی صف میں آتیں ہیں۔ مجوزہ مقالے میں مختلف پیش منظر میں بیان کیے گئے تصوف کا تقابلی جائزہ لیا گیا اور مجوزہ مقالے میں موجود اشتراکات اور افتراکات کا جائزہ لیا گا۔

۲۔ بیانِ مسئلہ (Problem Statement)

ایلف شفق اور جمیلہ ہاشمی نے مذکورہ ناولوں کی مدد سے تصوف کے حوالے سے خاص پہچان بنائی ہے۔ "چالیس چراغ عشق کے" اور "دشتِ سوس" میں دو مختلف پیش منظر اور مختلف واقعات کے ساتھ ایک ایسی کہانی دکھائی گئی

ہے جس کا ظاہر تو جدا نظر آتا ہے مگر باطن میں روح ایک ہی نظر آتی ہے مجوزہ مقالے میں تصوف کے حوالے سے ان ناولوں کا جائزہ لیا گیا۔ تصوف حدود قیود سے ماورا ہوتا ہے یا پھر دونوں ناول نگاروں نے مختلف پیش منظر کا سہارا لیتے ہوئے صرف مختلف خطوں کی مجازی عشق کی داستانیں بیان کی ہیں۔ تصوف میں مجازی عشق حقیقی عشق کا زینہ ہوتا ہے یا پھر ہر عشق مادی حد تک ہی محدود ہوتا ہے۔ تصوف اور عشق کے حوالے سے مقالے میں ناولوں کا جائزہ لیا۔ مجوزہ مقالے میں عورت کے متصوفانہ کردار کا جائزہ لیا گیا۔ صوفیا پر سماجی جبر و تسلط کا جائزہ لیا گیا اور اس جبر و تسلط کی وجوہات کو بیان کیا گیا۔

۳۔ مقاصدِ تحقیق Research objective

اس مقالے کے تحقیقی مقاصد درج ذیل ہیں:

ا۔ تصوف کے تحت عشق مجازی سے عشقِ حقیقی کے مدارج کا مطالعہ کرنا۔

۲۔ تصوف کا تاریخ کے تناظر میں مطالعہ کرنا۔

۳۔ دو مختلف تہذیبوں اور مختلف پیش منظر کے تحت دو مختلف ناول نگاروں کے ذہنوں پر بننے والے تصوف کے عکس کا مطالعہ کرنا۔

۴۔ تصوف اور آفاق گیر محبت کا مطالعہ کرنا۔

۴۔ تحقیقی سوالات (Research Question)

اس تحقیق میں درج ذیل سوالات میرے پیشِ نظر رہے:

ا۔ ایلف شفق اور جمیلہ ہاشمی کے ہاں تصوف کی نوعیت کیا ہے؟

۲۔ ایلف شفق اور جمیلہ ہاشمی نے تصوف کے لیے عشق ہی کو زینہ کیوں بنایا؟

۳۔ ایلف شفق اور جمیلہ ہاشمی کے ناولوں میں عورت کے متصوفانہ کردار کی نوعیت کیا ہے؟

۵۔ نظری دائرہ کار (Theoretical framework)

تصوف ایک بین الاقوامی تصور ہے اس لیے اسے کسی بھی زبان کا ادیب یا عالم بیان کرے روح ایک ہی ہوگی۔ محقق نے اپنے اس مقالے کے لیے میتھیو آرنلڈ کی تقابلی مطالعے کے حوالے سے ایک تعریف جو سوزن

بیسینٹ کی کتاب میں موجود ہے اس کو بنیاد بنایا اور پھر اسی بنیاد کے تحت مجوزہ ناولوں میں اشتراکات اور افتراکات کو پرکھا۔

Everywhere there is connection, everywhere there is illustration. No single event, no single literature is adequately comprehended except in relation to other events, to other literatures.

میتھیو آرنلڈ کے مطابق کسی ایک خطے کا ادب دوسرے خطے کے ادب کے ساتھ کسی نہ کسی طرح جڑا ہوا ہوتا ہے اور محقق نے مجوزہ مقالے میں میتھیو آرنلڈ کی اس بات کو بنیاد بنا کر دیکھا کہ کس طرح یہ دو مختلف پیش منظر اور مختلف زبانوں کی ناولیں آپس میں جڑت رکھتی ہیں۔

تصوف کے حوالے سے مولانا رومی کے اس قول کو بنیاد بنایا ہے۔

تشنگان گر آب جویند از جہاں آب ہجوید بعالم تشنگان

یعنی تو پانی تلاش کر رہا ہے جبکہ پانی تجھے تلاش کر رہا ہے۔ تو اس کا ہر گز مطلب یہ نہیں ہوا کہ عاشق کو آرام سے بیٹھنا چاہیے بلکہ یہ ہے کہ جو راہِ عشق میں ہے اسے تجلی ملے گی اس کا معشوق بھی اس کا طلب گار ہے۔

محقق نے مولانا روم کے اس قول کو بنیاد بنا کر اپنے اس تحقیقی کام میں اس بات کا جائزہ لیا کہ تصوف میں عاشق کی حالت کیا ہوتی ہے اور اس کا محبوب اس کی اس بے قراری کا کس قدر پاس رکھتا ہے۔

۶۔ تحقیقی طریقہء کار (Research Methodology)

محقق نے اس مقالے کے لیے تقابلی مطالے کا طریقہ تحقیق اپنایا ہے۔ مجوزہ ناولوں کے مواد کا تجزیا کیا ہے اور اس کے بعد طے شدہ نظریے کے مطابق ان کا تقابل کیا اور اس بعد اشتراکات اور افتراکات الگ الگ نوٹ کیے اور آخر میں ایک نتیجہ قائم کیا۔ اس تقابلی مطالعے کے بنیادی ماخذات "چالیس چراغ عشق کے" اور "دشت سوس" کے تقابل سے پہلے تصوف کے بنیادی مباحث وراس کے خصائص و وظائف کو بیان کیا گیا۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق Works already done

مجوزہ موضوع میں دو ناول نگاروں کے دو ناولوں کا تقابل کیا گیا، جس میں ایلف شفق کا ناول" چالیس چراغ عشق کے" اور جملیہ ہاشمی کا ناول "دشتِ سوس" شامل ہیں۔ ان ناولوں پر تقابلی مطالعہ کے تحت تصوف کے حوالے سے رسمی یا غیر رسمی کسی قسم کی کوئی تحقیق نہیں ہوئی ہے۔ اس طرح محقق کی تلاش اور شواہد کے مطابق ان ناولوں پر اس موضوع کے تحت کوئی کام نہیں ہوا۔ اردو ناول اور ترکی تہذیب میں انگریزی زبان میں لکھے گئے ناول کا تصوف کے حوالے سے تقابل یہ اپنی نوعیت کا پہلا تحقیقی کام ہے۔

۸۔ تحدیدDelimitation

محقق نے اس مقالے کے لیے دو ناول نگاروں کے دو ناول منتخب کیے تھے۔ ایلف شفق کا ناول "چالیس چراغ عشق کے" اور جمیلہ ہاشمی کا ناول "دشت سوس" ان کا تقابلی مطالعہ کیا گیا۔ ایلف شفق کی چودہ تحریریں ہیں جن میں نو ناول بھی ہیں محقق کے تحقیقی کام صرف چالیس چراغ عشق کے، تک محدود ہے اور مصنفہ کی باقی تحریریں اس تحقیقی کام میں شامل نہیں ہیں۔ جمیلہ ہاشمی بھی اردو ادب کی نامور ناول نویس اور افسانہ نگار ہیں۔ جو اپنے پہلے ہی ناول تلاشِ بہاراں پر حسن عسکری ایوارڈ یافتہ کارنامے سے اپنی مخصوص پہچان رکھتی ہیں ان کا دیگر تخلیقی کام اس تحقیق میں شامل نہیں۔

۹۔ پس منظری مطالعہ Literature Review

پسِ منظری مطالعے کے طور پر ایلف شفق اور جمیلہ ہاشمی پر تحریر کی گئی تحقیقی اور تنقیدی کتب سے استفادہ کیا گیا۔اس کے علاوہ مختلف رسائل و جرائد میں چھپنے والے مضامین، تبصرے اور تجزیے بھی پیشِ نظر رکھے گئے۔ ایلف شفق کے حوالے سے ان کے انٹرویوز بھی سنے گئے۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت Significance of Study

اس تحقیقی مقالے میں ترکش ناول نویس ایلف شفق اوراردو ناول نویس جمیلہ ہاشمی کے ہاں تصوف کا جائزہ لیا گیا۔ اس تحقیق سے دو مختلف ناول نگاروں کی تصوف کے بارے میں سوچ واضح ہو گئی۔ اس تحقیق سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ایک صوفی کے لیے پوری دنیا ایک ہی خطہ ہے اور اس کی محبت بھی جغرافیائی حدود سے ماورا ہے۔

اس تحقیقی کام سے موجودہ دنیا کی بے چینی کی وجوہات اور ان کا حل سامنے آیا ہے۔اس وقت پوری دنیا روحانی بے چینی کا شکار ہے۔اصل ضرورت انسانیت سے محبت اور انسانیت کی قدر کی ہے تاکہ انسان اپنا مقام پہچان سکے اور معاشرہ ترقی کر سکے۔شمس تبریز نے ایک صوفی بن کر انسانیت سے محبت کو اپنا شعار بنایا اور مولانا روم نے دینی اور دنیاوی تعلیم کی اہمیت کو ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کو اصل ذمہ داری سے روشناس کروایا۔اس تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ یورپ اور امریکہ جو مادی ترقی کے لحاظ سے تو شاید اپنا ثانی نہیں رکھتے مگر روحانی ترقی کے لیے آج بھی کسی شمس تبریز اور مولانا روم کے منتظر ہیں۔

اس تحقیق سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ عام آنکھ انسان کے ظاہر کو دیکھ کر اس کا مقام متعین کرتی ہے اور اسے عزت دیتی ہے اور انسانیت شناس آنکھ انسان کے باطن کو دیکھ کر اس کا مقام متعین کرتی ہے۔انسان کا ظاہری حلیہ دنیاوی مجبوریوں کی وجہ سے آلودہ ہو سکتا ہے مگر اس کا باطن خالقِ حقیقی سے رشتہ کا عکاس ہوتا ہے اور انسان کا اصل مقام اسی بنیاد پر متعین کیا جاسکتا ہے۔

انسان اور خدا کا تعلق ہر کامیاب معاشرے کی بنیادی اکائی ہے۔اس تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ایک اللہ والا اللہ کی رضا کے لیے اپنا تن من دھن قربان کر دیتا ہے۔جب کوئی بھی شخص اپنی جان جیسی عزیز ترین متاع کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے وہاں قربانی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور انسان انسانیت کا ہمدرد بن جاتا ہے۔اس تحقیق سے جہاں انسان اور خدا کا مضبوط ترین تعلق واضح ہوا ہے وہاں کامیاب معاشرے کے بھی اصول و ضوابط واضح ہو گئے ہیں۔

اس تحقیق سے دونوں ناول نگاروں کی تصانیف کا جائزہ لینے کے بعد ان کے ہاں تصوف کی نوعیت اور عناصر واضح ہو گئے۔اس طرح تصوف کے بارے میں بہت سے نہاں گوشے عیاں ہوئے۔جہاں تک ایک صوفی کو محدود ذہنیت کا مالک کہا جاتا ہے تو اس تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ صوفی اپنے ظاہر کو تج کر باطن کی دنیا میں مگن رہتا ہے اور اس بات کے لیے بعض اوقات وہ بڑی سے بڑی اذیت بھی اپنی جان پر برداشت کر جاتا ہے مگر باطن کو نقصان نہیں پہنچنے دیتا۔

اس تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ بظاہر دو مختلف پسِ منظر سے تعلق رکھنے والی ناول نگار کس طرح تصوف کے حوالے سے مشترک سوچ رکھتی ہیں،اس تحقیق سے یہ بات واضح ہو گئی کہ تصوف کے وجود کے ظاہری مناظر

وواقعات مختلف ہو سکتے ہیں مگر روح ایک ہی ہوتی ہے اور تصوف کے حوالے سے مجوزہ ناولوں میں کچھ ایسے مناظر و واقعات کی عکاسی بھی کی گئی جن کی بنا پر اختلاف موجود تھا۔ دونوں ناول نگاروں نے تصوف کو کس حد تک واضح کیا ہے اور تصوف کے لیے کس بات کو معیار بنایا ہے یہ حقائق بھی اس مقالے میں سامنے آئے۔

اس تحقیق سے تصوف کے حوالے سے عورت کی محبت اور اس کی اہمیت بھی واضح ہو گئی۔ اس تحقیق سے دو مختلف ذہنوں سے تصوف کے حق میں اٹھنے والے بیانات جن سے تصوف کو آفاق گیر محبت کا درجہ ملا ہے واضح ہو گئے اور یہ تقابلی مطالعہ اردو میں ایک کار گر اضافہ ثابت ہو گا اور اس سے تصوف کے حوالے سے بہت سے سوالات حل ہو گئے۔

ب۔ تقابلی مطالعہ کیا ہے:

تقابلی مطالعہ سے مراد ہے دو چیزوں کو آمنے سامنے لا کر ان کے خصائص کو پرکھنا اور ان میں موجود اشتراکات و افتراقات کو بیان کرنا۔ تقابلی مطالعے کے لیے انگریزی زبان میں (Comparative Studies) کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

تقابلی مطالعے کی ابتدا کے حوالے سے سب سے پہلے فرانس کا نام سامنے آتا ہے جہاں اس اصطلاح کا استعمال ہوا مگر اس وقت اس اصطلاح کا استعمال ادبی تخلیقات کے تقابل کے لیے استعمال نہیں ہوا تھا مگر کچھ عرصہ بعد یہ اصطلاح ادب میں آ گئی۔ تقابلی مطالعے کی ادبی بنیاد اور مباحث چھیڑنے سے پہلے لفظ "تقابل" کے اردو اور انگریزی لغات سے معنی دیکھتے ہیں۔ انگریزی لغت ''کولنز کوبلڈ'' میں معنی کچھ یوں ملتے ہیں۔

> "Comparative: you use comparative to show that you are judging something against a previous or different situation which is calmer than before or calmer than the situation in other places".[1]

اردو لغت میں لفظ "تقابل" کے معنی۔۔۔۔

تقابل: مقابلہ، موازنہ۔ صف: تقابلی موازنے سے متعلق، موازنے کی غرض سے م: تقابلی مطالعہ[2]

تقابلی مطالعے کی اصطلاح کے معنی کوئی سی دو چیزیں جو قریب قریب ایک ہی گروہ (صنف) سے تعلق رکھتی ہوں ان کا تجزیہ کرنا۔ جب کوئی سی دو چیزوں کو آمنے سامنے لائیں گے تو ان کے اشتراکات اور افتراکات بھی سامنے آئیں گے۔ تقابلی مطالعے کے حوالے سے کچھ تعریفیں دیکھتے ہیں۔

برطانیہ میں موجود وارک یونیورسٹی کی پروفیسر سوزن بیسنٹ یوں تعریف کرتی ہیں:

"تقابلی ادب مختلف ثقافتوں کے متوں کا مطالعہ ہے۔ ایکلشیر العلمی مضمون جس کا زمان اور مکان کے بعد میں پیدا ہونے والے ادب کے درمیان رشتوں کے نقوشسے متعلق ہے۔"[۳]

تقابلی مطالعے کے حوالے سے کسی نے اس طرح تعریف کی ہے:

"The study of the interrelationship of the literatures of Two or more national culture usually of differingand especially of the influences of one upon the other. Sometimes: informal study of literary works in Translation."[۴]

تقابلی مطالعے کے حوالے سے ایک یہ بات بھی سامنے آئی کے دو یا سے زیادہ قوموں کے ادب کا موازنہ کیا جاتا ہے۔ تقابل کرنے والا ان کے درمیان کسی نہ کسی لحاظ سے کوئی تعلق ضرور دیکھے گا تب ہی وہ ایک ادبی پارے کو دوسرے کے سامنے لائے گا۔ جدید تحقیق میں تو تقابلی مطالعے کے حوالے سے صنفی یکسانیت کو بھی مد نظر رکھ کر ہی تحقیق کا آغاز کیا جاتا ہے۔ تقابلی مطالعے کی ایک اور تعریف دیکھتے ہیں:

"A comparative research is a researchmethodology in the Social sciences that aims to make comparisons acrossdifferent countries and cultures".[۵]

تقابلی مطالعہ دو مختلف ممالک کے ادب کے درمیان ایک رشتہ پیدا کر دیتا ہے اور اس رشتے سے دونوں ممالک کے ادب کے اشتراکات اور افتراکات سامنے آتے ہیں۔

تقابلی مطالعے میں مشترک بنیاد والی اشیا کو لیا جاتا ہے اور پھر ان کی قدریں متعین کی جاتی ہیں مگر ان قدروں کو متعین کرتے ہوئے اشتراکات اور افتراکات کو ہی مد نظر رکھنا چاہیے مگر یہاں بہت سے ناقدین صرف

اور صرف ایک ادبی پارے کو دوسرے پر ترجیح دینے کے لیے ہی تقابل کرتے ہیں اس سے ابو الاعجاز حفیظ صدیقی اپنی کتاب "کشاف تنقیدی اصلاحات" میں تقابلی مطالعے کی یوں تعریف کرتے ہیں:

> ''موازنہ مشترک بنیاد رکھنے والی دو چیزوں کا تقابلی مطالعہ ہے۔اصولاً موازنہ میں ترجیح کاسوال شامل نہیں لیکن بالعموم موازنہ کرنے والا ناقد ایک فنکار یا فن پارے کی دوسرے فنکار یا فن پارے پر ترجیح ثابت کرنے کی خواہش سے کلی اجتناب نہیں برت سکتے۔ بعضاوقات نقاد کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ایک ادب پارے کی دوسرے ادب پارے یا ایک فنکار کی دوسرے فنکار پر ترجیح ثابت کی جائے۔''[۶]

تقابلی مطالعے میں کسی ایک ادیب کی دوسرے پر یا ایک فن پارے کی دوسرے پر برتری ثابت کرنا مقصد نہیں ہوتا مگر بعض ناقدین حضرات صرف اسی لیے تقابل کی فیلڈ میں قدم رکھتے ہیں تاکہ اپنے من پسند ادیبوں اور فن پاروں کو دوسروں پر ترجیح دے سکیں۔ تقابلی مطالعے کی ضرورت کے حوالے سے ایک جہت یہ بھی سامنے آتی ہے دنیا کے ہر حصے میں بسنے والے انسان ایک دوسرے سے کسی نا کسی طور پر ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں ۔چاروں اطراف میں پھیلے ہوئے انسانوں کے درمیان بہت سی صفات مشترک ہوتی ہیں اور اس طرح زبان سے بالاتر ہو کر ادب میں بھی اکثر مقاماتپر یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس حوالے سے میتھو آرنلڈ نے ۱۸۵۷ء میں آکسفورڈ میں دیے گئے لیکچرز میں بیان کیا تھا۔

> ''ہر طرف رشتے بکھرے ہیں جن کے مظاہر ہمیں چاروں اطراف نظر آتے ہیں۔ کسی ادب یا واقعے کی مکمل سمجھ اس کے دوسرے ادب اور واقعات کے ساتھ رشتے کی پہچان سے ہی مل سکتی ہے۔''[۷]

گوئٹے کے ہاں بھی تقابلی ادب کی تعریف کے حوالے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ کے اندر دنیا کی دیگر اقوام کے متعلق جاننے کا بھی شوق ہونا چاہیے کیونکہ ادب ایک عالمگیر اکائی کی طرح ہے۔ گوئٹے کی اس بات کو سوزن بیسنٹ نے اپنی کتاب ''تقابلی ادب'' میں نقل کیا ہے:

> ''میں بدیسی ادب سے واقف رہنا چاہتا ہوں'' اور دوسروں کو اس کی ترغیب دلاتے ہوئے کہا'' مجھ پر یہ عیاں ہو تا رہا ہے شعر ساری انسانیت کی مشترک میراث ہے''[۸]

امریکہ میں بھی تقابلی ادب کو چارلس ملز گے لی نے متعارف کروایا اور پھر اس مطالعے نے امریکہ میں بھی بھرپور توانائی حاصل کرلی۔ چارلسملز تقابلی مطالعے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ادب فکر کا ایک واضح اور مربوط میڈیم ہے۔ انسانیت کا مشترکہ اداراتی بیان ہے جس میں تفریق کی وجوہات، فرد کے سماجی حالات، نسلی، تاریخی اور ثقافتی اور لسانی اثرات، مواقع اور قیود ہیں لیکن عہد اور بھیس کی تمیز کے بغیر تقابلی ادب کا منبع وہ مشترکہ انسانی ضروریات اور عزائم ہیں جو ذہن کی مشترکہ نفسیاتی، فعلیاتی صلاحیتوں سے جنم لیتی ہیں اور فرد اور سماجی انسانیت کے مشترکہ مادی اور اکتسابی قوانین کی پابند ہیں"۔[9]

چارلس ملز کے اس بیان سے تقابلی مطالعے کی حدود اور بھی وسعت اختیار کر جاتی ہیں اور اس مطالعے کی اہمیت بھی عیاں ہیں۔ چارلس ملز کے مطابق زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جو ایک انسان کا دوسرے انسان سے اور ایک خطے کا دوسرے خطے سے جڑا ہوا نہ ہو اور دوسری بات عہد اور بھیس کی تمیز کیے بغیر ادب میں اشتراکی عناصر موجود ہیں کیونکہ انسان ہر دور میں نفسیاتی اور فعلیاتی طور پر ایک جیسی حرکات سے آراستہ رہا ہے۔ چارلس ملز کے اس بیان سے تقابلی مطالعے کے حوالے دوسری بات جو سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ ادب میں جو تمیز اور حدود ہیں ان کی وجوہات، کسی بھی معاشرے کے معاشرتی، معاشی اور اخلاقی حالات ہیں۔ اس کے علاوہ نسلی اختلاف موجود ہونے پر بھی ادب میں تفریق پیدا ہو گی۔ مگر یہ تفریق بہت چھوٹی ہوتی ہے مگر جو ایک ادب کی دوسرے ادب سے جڑت ہے وہ بہت واضح ہے۔

تقابلی مطالعے کی اہمیت سے کوئی بھی ذی شعور انکار نہیں کر سکتا اور اس کی اہمیت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ اس کی اہمیت کا اس سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اب تقابلی مطالعہ ادب اور معاشرے کے لیے جزو لانیفک کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ تقابلی مطالعے کی ضرورت و اہمیت کے حوالے سے درج ذیل اہم نکات سامنے آتے ہیں۔

۱۔ تقابلی مطالعے کی بدولت ہر زبان کو ادب کے نئے لکھاری ملے۔

۲۔ تقابلی مطالعے نے ایک مضبوط ادبی معاشرے کی بنیاد رکھی۔

۳۔ ادبی دنیا کو گلوبلویلج بنانے میں تقابلی مطالعے کا کردار نہایت اہم ہے۔

۴۔ تقابلی مطالعے نے کلاسیکی ادب اور جدید ادب کی حدود کو ملا کر کلاسیکی ادب کو جدید ادب کے لیے تمہید اور زمین بنا دیا۔
۵۔ تقابلی مطالعے کی بدولت دوسری زبانوں اور دوسرے معاشروں کے ادب سے نئے لسانی قوانین اور معاشرتی رسم و رواج حاصل ہوئے۔
۶۔ تقابلی مطالعے نے ادبی اقدار کو وسعت دی۔
۷۔ تقابلی مطالعے سے لسانی مہارتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔
۸۔ تقابلی مطالعے سے نسلی اور ثقافتی تعصبات دب جاتے ہیں اور قارئین کے لیے محبت سے بھرپور ادب وجود میں آتا ہے۔ تقابلی مطالعے سے نئے ادیبوں کو لکھنے کی نئی نئی مہارتیں میسر آتی ہیں اور اس سے ان کی تحریریں بھی جلد ہی عالمی معیار حاصل کر لیتی ہیں۔

تقابلی مطالعے کے آغاز پر نظر دوڑائی جائے تو اس کا آغاز مغرب سے جڑا ہوا نظر آتا ہے۔ مغرب میں فرانس سے اس کی ابتدا کے شواہد ملتے ہیں۔ اس کے آغاز کے حوالے سے فرانس کا نام سامنے آتا ہے اور فرانس کا نام سامنے آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی فرانس کو ترقی کے دیگر امور کے ساتھ ساتھ ادب میں خاص اہمیت حاصل تھی۔ اس حوالے سے فلاریت چارلز کے ایک اہم نکتے کو پروفیسر سوزن بیسنٹ نے اپنی کتاب ''تقابلی مطالعے'' میں نقل کیا ہے۔ فلاریت چارلز کہتے ہیں:

> ''فرانس سب سے حساس ملک ہے'' اور یہ کہ ''جو مقام دنیا میں یورپ کو حاصل ہے، وہ یورپ میں فرانس کا ہے'' مزید یہ کہ ''وہ تنگ نظری اور اندھی قوم پرستی کا سخت مخالف ہے''۔[۱۰]

فلاریت چارلز کی بات سے بھی فرانس کی اہمیت اور اور فرانس کے ادب کی اہمیت سامنے آتی ہے۔ فرانس دنیا کے باقی ادبی خطوں کو اپنے ادب سے کم تر جانتا تھا۔ اسی طرح باقی مغربی ممالک کے ادیبوں اور ناقدین نے بھی ایشیائی اور دیگر پسماندہ ممالک کے ادب کو مغرب کے ادب سے کم تر جانا۔ اس کمتری کے احساس کو دور کرنے کے لیے دنیا کے باقی ممالک کے ادیب بھی اپنے ادب کا مغرب سے تقابل کرنے لگے اور اس طرح دنیا کے باقی خطوں میں بھی ادب کی صورت حال بہتر ہونے لگی۔ مغرب نے دنیا کے باقی ادب کو ردی کی ٹوکری قرار دیا تو اس حوالے

سے فلاریت چارلز سے ملتی جلتی بات لارڈ مکالے نے کہی تھی، جسے سوزن بیسنٹ نے اپنی کتاب ''تقابلی مطالعہ'' میں لکھا ہے:

> ''اس سے ملتا جلتا رویہ لارڈ مکالے کا تھا جس نے ہندوستان اور عربوں کے سارے ادب کو ردی کی ٹوکری کا درجہ دیا کیونکہ چارلز کی طرح اسے بھی اپنی ثقافت کی برتری کا کامل یقین تھا''۔[۱۱]

تقابلی مطالعے کو اپنانے کا جوں جوں رجحان بڑھتا چلا گیا جیسے جیسے اس کی مقبولیت بھی بڑھتی چلی گئی اور اس طرف مختلف ممالک میں تقابلی مطالعے کے حوالے سے مختلف دبستانیں وجود میں آئیں۔ تقابلی مطالعے کے حوالے سے جو دبستانیں وجود میں آئیں ذیل میں ان کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔[۱۲]

ا۔ فرنچ سکول آف تھاٹ French School of thought

ب۔ جرمن سکول آف تھاٹ Jermen School of thought

ج۔ امریکن سکول آف تھاٹ American School of thought

الف۔ فرنچ سکول آف تھاٹ:

فرانس میں تقابلی مطالعے کی ابتدا ۱۸۰۵ء میں ہوئی لیکن آغاز میں اس مکتبہ فکر کے تحت بہت آہستہ روی سے کام ہوتا رہا اور پھر بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے وسط ۱۸۴۹۔۱۸۴۵ء تک یہ مکتبہ فکر اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا اور فرانس میں اس کے تحت بہت سا کام ہو چکا تھا۔ فرانس میں ابتدائی دور میں بنیادی ماخذات کے حوالے سے تقابل کیا جاتا تھا یا پھر اس دور میں کوئی واقعہ نمو پذیر ہوا ہو تو اس کی حقیقت کے حوالے سے تقابل کیا جاتا تھا۔ ماخذات اور حادثات کے تقابل نے اتنے بہترین نتائج مہیا کیے کہ اس کے دنیا کے دیگر ممالک بھی اس کی طرف بڑھے۔

ب۔ جرمن سکول آف تھاٹ:

جرمن سکول آف تھاٹ کا آغاز ۱۸۷۰ء کے قریب قریب ہوتا ہے۔ جرمن سکول آف تھاٹ فرانسیسی سکول آف تھاٹ کے مقابلے میں کافی تبدیل تھا مطلب اس میں بنیادی ماخذات سے بڑھ کر دیگر تحریروں پر بھی اس کے اثرات تھے اور اس کو دیگر تحریروں میں اس قدر کامیابی ملی کہ گیتوں پر بھی ساختیات کے حوالے سے

تقابل کیا جانے لگا۔ اس طرح جرمن سکول آف تھاٹ میں تقابلی مطالعہ فرانسیسی سکول آف تھاٹ سے آگے بڑھ گیا۔

ج۔ امریکن سکول تھاٹ:

امریکن سکول آف تھاٹ بنیادی طور جرمن سکول کی ضد کے طور پر سامنے آیا تھا۔ امریکن سکول آف تھاٹ بنیادی ماخذات کی چھان بین سے بڑھ کر ادب پارے کے محاسن و معائب کو کھرچا گیا۔ امریکن سکول آف تھاٹ میں بین الاقوامی ادب پاروں کا تقابل کیا گیا اس طرح تقابلی مطالعہ ایک محدود خطے سے نکل کر پوری دنیا میں پھیل گیا۔ آج تقابلی مطالعہ ایک مضمون کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

ا۔ تقابلی مطالعے کی مشرقی روایت

مشرق میں تقابلی مطالعے کی بنیاد مولانا محمد حسین کے خطبے سے پڑی۔ اس طرح مولانا الطاف حسین حالی کے مقدمہ شعر و شاعری میں بھی تقابلی مطالعے کی طرف چند اشارے ملتے ہیں۔ اس کے بعد شبلی نعمانی کی کتاب "موازنہ انیس و دبیر" میں بھی انیس اور دبیر کے حوالے موازنہ ملتا ہے اور شبلی نے تو باقاعدہ طور پر انیس اور دبیر کے اشتراکات اور افتراکات پر بات کی ہے اور نتائج بھی قلم بند کیے ہیں۔ اس طرح مشرق میں بھی تقابلی مطالعے کی روایت کے اشارات ایک صدی پہلے سے ملتے ہیں۔

تقابلی مطالعے کی مشرقی روایت بھی اردو ادب کے ہم عمر ہی قدیم ہے مگر اسے ایک باقاعدہ روایت منوانے میں اور بنانے کے لیے کچھ دیر لگی۔ اردو ادب میں تقابلی مطالعے کے اثرات تو محمد حسین آزاد کے تذکرے ''آبِ حیات'' میں موجود تھے۔ محمد حسین آزاد نے اردو غزل کے باوا آدم ولی دکنی کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ولی دکنی اپنے دوست ابوالمعالی کے ساتھ دلی آئے تو وہ سعد اللہ گلشن کے مرید ہوئے۔ محمد حسین آزاد نے ولی اور سعد اللہ گلشن کے دیوان کا موازنہ کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ دیا کہ ولی کا دیوان سعد اللہ گلشن کے فارسی دیوان کے اشارے پر ہے۔ مزید وہ اپنے وقت کی زبان اور ولی کے عہد کی زبان کا تقابل بھی ولی کے دیوان سے ہی کرتے ہیں۔

> ''ان کا دیوان اس عہد کے مشاعروں کی بولتی تصویر ہے، کیو کہ اگر آج دریافت کرنا چاہیں
> کہ اس وقت کے امرا و شرفا کی کیا زبان تھی؟ تو اس کیفیت کو سوا دیوان ولی کے اور کوئی

نہیں بتا سکتا۔ انہی کے دیوان سے ہم اس وقت اور آج کی زبان کے فرق بخوبی نکال سکتے ہیں۔"[۱۳]

محمد حسین آزاد نے میر تقی میر کا احوال قلمبند کرتے ہوئے میر کے قصائد کو سودا کے قصائد سے کم درجے کا قرار دیا ہے اور الفاظ اور مضامین کے حوالے سے جن امورِ لازمی کی ضرورت ہوتی ہے ان کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ آبِ حیات میں وہ لکھتے ہیں:

"چونکہ مطالب کی دقت، مضامین کی بلند پروازی، الفاظ کی شان و شکوہ، بندش کی چستی لازمہ قصائد کا ہے، وہ طبیعت کی شگفتگی اور جوش و خروش کا ثمر ہوتا ہے۔ اسی واسطے میر صاحب کے قصیدے کم ہیں اور اسی قدر درجے بھی کم ہیں۔۔۔ اور اسی منزل پر آکر سودا اور میر کے کلام کا حال کھلتا ہے۔"[۱۴]

محمد حسین آزاد اگر شبلی نعمانی کی طرح ان شعراء کا باقاعدہ موازنہ کرتے تو میر اور سودا کے قصائد کے تقابلی مدارج بھی کھل کر سامنے آجاتے مگر انہوں نے صرف اشارے دیے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک مکمل تقابل کرنا مقصود نہیں تھا بلکہ صرف اور صرف اردو کے ستونوں کا احوال قلمبند کرنا مقصود تھا۔

مولانا شبلی نعمانی قواعد کی باریکیوں سے بخوبی واقف تھے اس لیے انہوں دو نامور اور زبان و بیان کے حوالے سے مشکل شاعر کا انتخاب کرکے ان کے بیان کردہ مضمون سے لے کر زبان کی باریکیوں تک کا تقابل کیا۔ مولانا شبلی نعمانی کا طریقہ تقابل بھی جدید روایت کے مطابق تھا۔ مولانا شبلی نعمانی نے مرثیے کے دو عظیم شاعروں کا انتخاب کیا اور پھر باری باری ان کے کلام کی باریکیوں کا تجزیہ کیا۔ موازنے کے آخر میں انہوں نے دونوں شاعروں کے کلام کی خصوصیات کو ایک ساتھ بیان کیا۔ مولانا شبلی موازنے کے اختتام پر لکھتے ہیں:

"اُردو علم ادب کی جو تاریخ لکھی جائے گی، اس کا سب سے عجیب تر واقعہ یہ ہو گا کہ مرزا دبیر کو ملک نے میر انیس کا مقابل بنایا، اور اس بات کا فیصلہ نہ سکا کہ ان دونوں حریفوں میں ترجیح کا تاج کس کے سر پر رکھا جائے۔۔۔ یہ امر بدیہی ہے کہ مرزا دبیر کے کلام میں وہ فصاحت اور شستگی نہیں جو میر انیس کے کلام میں ہے۔"[۱۵]

۲۔ تقابلی مطالعے کی اقسام

بیانیہ تقابل	تعین قدر
Normative/Rhetorical Comparison	Descriptive/ Logical Comparison

بیانیہ تقابل میں ادب پارے یا کسی چیز کے بیرونی خدوخال کو دیکھا جاتا ہے مطلب ادب پارے کی ہیت اور دوسری چیزوں کی بیرونی شکل و شباہت کو دیکھا جاتا ہے مثلاً اگر ایک گلاب کے پھول کا بیانیہ تجزیہ کیا جائے تو اس میں اس پھول کی شکل، سائز، رنگ اور پتیوں کی تعداد کو زیرِ بحث لایا جائے گا۔

Normative میں خالصتاً ادب کے حوالے سے تقابل کیا جاتا ہے۔ اس مطالعے میں خالصتاً ان حالات کا تجزیا کیا جاتا ہے جن کے تحت یہ ادب پارہ وجود میں آیا۔ اس مطالعے میں یہ باتیں سامنے آتی ہیں کہ ایسے کون سے عناصر تھے جنھوں نے اس ادب پارے کے ادیب یا شاعر کو تخلیق کرنے پر مجبور کیا۔

جب ادب پارے کو تقابل کے لیے منتخب کیا جاتا ہے تو اس میں اس کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں کو خاص طور پر مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ خارجی محرکات میں تقابلی مطالعے کے لیے منتخب ادب پارے کے ہمعصر سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی حالات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ خارجی حالات کا تجزیہ کرنے سے وہ سب اثرات سامنے آجاتے ہیں جنھوں نے اس شاعر یا ادیب کو اس فن پارے کو تخلیق کرنے کی ترغیب دی یا اس ادب یا شاعر کو اس کے تخلیق کی ضرورت پیش آئی۔

داخلی محرکات میں اس ادیب یا شاعر کے ذاتی حالات کا تجزیا کیا جاتا ہے۔ داخلی محرکات میں اس ادیب یا شاعر کے معاشی، خاندانی، تجرباتی، مشاہداتی، نفسیاتی اور مذہبی حالات شامل ہیں۔ داخلی محرکات کا تجزیہ کرنے سے اس ادب پارے کی روح سامنے آجاتی ہے کیونکہ ادب پارے میں ایک بڑا حصہ اس ادیب یا شاعر کا اپنا عکس ہوتا ہے۔

تقابلی مطالعہ میں تجزیہ کرتے ہوئے اس ادب پارے کے فرق و امتیاز کو بیان کیا جاتا ہے۔ تقابلی مطالعے کے تنقیدی پہلو پر غور کریں تو اس سے ادب پارے کے مقام کا بھی تعین ہو جاتا ہے۔ ”تقابل، تجزیہ، فرق و امتیاز اور تعین قدر و مقام تنقید کے چار پہلو یا عناصر اربعہ ہیں۔

ج۔ تصوف:

صوف۔ تصوف

عربی زبان سے اسم مشتق ہے ثلاثی مزید فیہ کے باب تفعل سے مصدر ہے اور اردو میں بطورِ مصدر مستعمل ہے۔ اردو میں سب سے پہلے ۱۶۸۲ء کو شاہی کے کلیات میں مستعمل ملتا ہے۔

اسم کیفیت (مذکر۔ واحد)[16]

وہ مسلک جس کے وسیلے سے صفائی قلب حاصل ہوتی ہے۔ تزکیہ نفس کا طریقہ، اشیائے عالم کو صفات حق کا مظہر جاننا، علم معرفت۔ تصوف کی بنیاد تمام تر وارداتِ باطنی پر تھی۔

تصوف کی ذیلی اقسام میں سے ایک قسم جس میں تصوف اور اس کے متعلقات سے بحث ہوتی ہے یا وہ قسم جس میں درویش اپنے جذبات کا اظہار صرف لباس سے کرتے ہیں، صوف پوشی، پشمینہ پوشی۔

تصوف میں اکثر اوقات تزکیہ نفس اور روح کی صفائی کی بات کی جاتی ہے اور یہ سلسلہ اکثر یہیں سے ہی شروع ہوتا ہے۔ صوفیا کرام خود بھی اپنا تزکیہ کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی تزکیے کی فکر دیتے رہتے ہیں۔ آل احمد سرور نے ''اقبال اور تصوف'' نامی کتاب لکھی اس میں تصوف کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

> ''تصوف کی تعریف اور اس کی اصل حقیقت ہے تزکیہء نفس اور تجلئیہ باطن کرکے ایسا پاک و صاف اور روحانی کمالات اور اخلاقی بلندی کے اعتبار سے ایسا بن جانا کہ دل عشقِ الٰہی کا گہوارہ ہو''۔[17]

اے جے آربری انگریزی زبان لکھی ہوئی اپنی کتاب "صفیازم" میں تصوف کے حوالے سے کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

"The theology of the Sufis or mystics of the East: mysticism: Devoting oneself to contemplation"[18]

لفظ تصوف کا ماخذ:

عربی زبان کی رو سے اس لفظ کی شہادت معدوم ہے۔ اس حوالے سے ''حقیقتِ تصوف" میں محمد مختار خان غزنوی لکھتے ہیں:

"عربی زبان کی رو سے اس نام کی اصل شہادت نہ قیاس سے ملتی ہے، نہ ہی اشتقاق سے ،واضح امر تو یہی ہے کہ یہ نام لقب کی طرح ہے۔ اب رہے وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ 'صوف' سے اور "تصوف" سے نکلا ہے کیونکہ۔ کیونکہ عربی میں جو کوئی صوف لباس پہنے تو اس کے لیے تصوف کا لفظ بولتے ہیں۔ جس طرح قمیض پہننے کے لیے تقمص کا لفظ بولا جاتا ہے۔ تو یہ اس کے اشتقاق کی ایک وجہ ہو سکتی ہے مگر ان لوگوں کا مخصوص لباس صوف نہ تھا (البتہ اکثر یہی پہنا کرتے تھے)"۔[19]

تصوف اور صوفی کے تعلق کو کچھ لوگ مسجد نبوی کے چبوترے "صفہ" سے جوڑتے ہیں مگر اس روایت میں بھی کوئی حقیقت نظر نہیں آتی کیونکہ صفہ کا اسم نسبت "صفی" آتا ہے۔ اس اسم نسبتی کے بعد صوفی کے لفظ کو صفہ کے ساتھ نہیں جوڑا جا سکتا۔

صوفی کے لفظ کو کچھ لوگ صفاء کے ساتھ جوڑتے ہیں یہ بھی ٹھیک نہیں کیونکہ اس حوالے کو لغت صحیح ثابت نہیں کرتے ہیں۔ اس حوالے سے مختار احمد غزنوی اپنی کتاب "حقیقتِ تصوف" میں لکھتے ہیں:

"ان لوگوں کا قول جو اسے صفاء سے مشتق بناتے ہیں۔ یہ لغت کے لحاظ سے بعید از قیاس ہے"[20]

تصوف کی تعریف کے حوالے سے کچھ مشہور بزرگانِ دین کے اقوال:

ابو محمد جریری کا قول:

"میں نے محمد بن یحیی الصوفی سے سنا کہ عبداللہ بن علی التمیمی فرماتے تھے کہ کسی نے ابو محمد جریری سے تصوف کے متعلق سوال کیا تو فرمایا: یہ ہر اعلی خلق میں داخل ہونے اور ہر ذلیل خلق سے نکلنے کا نام ہے"۔[21]

تصوف کے حوالے سے حسین بن منصور کا قول محمد مختار خان غزنوی نقل کرتے ہیں:

"میں نے ابو عبد الرحمن السلمی سے سنا کہ عبد الواحد بن محمد الفارسینے کہا کہ انھوں نے ابو الفاتک سے سنا کہ الحسین بن منصور سے کسی صوفی کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا: صوفی کی ذات یکتا ہوتی ہے۔ نہ کوئی (اللہ کے سوا) اسے قبول کرتا ہے اور یہ اللہ کے سوا کسی کو قبول کرتا ہے"۔[22]

اے جے آربری اپنی کتاب ''صفیازم'' میں تصوف اور صوفی کا تعلق واضح کرتے ہوئے صوفی کی تعریف کرتے ہیں:

"Passing through the various states and stages Of the spiritual pilgrimage, he encounters manProofs of the special relationship in which he Stands to God".[۲۳]

شمس الدین عظیمی اپنی کتاب ''تصوف'' میں تصوف کی تعریف کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''روحانیت یا''تصوف'' روح انسانی سے واصل ہونے کا جذبہ ہے۔ تصوف اپنی انا کا کھوج لگانے کا علم ہے''۔[۲۴]

تصوف کے لغوی معنی اور مختلف عالموں سے تصوف کی تعریف جاننے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تصوف کے لغوی معنوں اور بنیاد کے متعلق کچھ غلط رائے بھی رائج ہیں اور تصوف کو صفاء، صوف اور صفہ سے جوڑنے کی جو روایتیں سامنے آئی ہیں وہ بھی درست نہیں ہیں۔ اس اصطلاح کے معنی کچھ بھی ہوں مگر ایک بات اہم اور مشترک ہے وہ یہ کہ تمام صوفیا نے اپنے نفس کی کھوج لگائی اور خود کو خدائے بزرگ و برتر کی ذات کے تابع رکھ کر خود کو اس کی راہ کے لیے وقف کر دیا۔ تصوف اور صوف کے معنوں میں بے شک حقیقت نہ ہو مگر اتنا ضرور ہے کہ زیادہ تر بزرگ اور اولیا کرام اون کا لباس پہنتے تھے۔

تصوف کے لفظ کے حوالے سے مختلف روایات سامنے آتی ہیں لیکن ایک بات واضح ہے کہ جس قدر حضرت انسان کی تاریخ پرانی ہے اس قدر ہی تصوف کی معنوی تاریخ بھی پرانی ہے کیونکہ کہا جاتا ہے اللہ تعالی نے حضرت آدمؑ کو اُن تمام علوم کا علم سکھایا جن کا جاننا ضروری تھا کیونکہ ان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجنا تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالی نے حضرت انسان کو اپنی روح میں سے کچھ پھونک کر اپنی معرفت عطا فرمائی۔ علم تصوف چونکہ عرفان ذات سے متعلق ہے اس لیے ازل سے انسان نے اپنے خالق کا عرفان حاصل کر لیا تھا۔ تصوف کا علم اپنی ذات اور خالقِ حقیقی کے عرفان کا علم ہے اس لیے یہ عوام الناس اور نہ ہی خاص کا علم ہے بلکہ خاص الخاص کا علم ہے۔ یہ وہ علم ہے جس میں انسان کو دل کا نذرانہ پیش کرنا پڑتا ہے اس لیے علماء اور عوام اس سے دور ہی رہتے ہیں اور چند خاص الخاص لوگ ہی ہوتے ہیں جو اس گھاٹی میں داخل ہوتے ہیں اور کامیاب ٹھہرتے ہیں۔

تصوف وہ عشق ہے جس میں کھو کر خالق کا بندہ باقی مخلوق کی پرواکیے بغیر خالق کے عشق میں جلتے جلتے کندن بن جاتا ہے۔ تصوف کا در مرادیہی ہے کہ ایک صوفی اپنی ذات کو اپنے خالق کی ذات میں گم کر دے۔

۲۔ تصوف اور انگریزی لغات:

Sufi is a member of a very spiritual group of muslims

Sufism :is the teachings of the sufimystics[۲۵]

د۔ تصوف اور اسلام

اسلام کی شریعت اور طریقت بھی یہی ہے کہ انسان جسمانی پاکیزگی اور اعمال کے ساتھ ساتھ اپنے نفس سے بھی واقفیت حاصل کرے کیونکہ جب تک انسان اپنی ذات کو نہیں پہچان لیتاتب تک وہ اپنے رب تک بھی ویسے یقین کے ساتھ نہیں پہنچ پاتا جیسا یقین اسے چاہیے ہوتا ہے۔

اسلام کی شریعت اور طریقت کے بالکل مشابہ ایک صوفی بھی خدا کے حضور خود کو ایک بڑے کامل یقین کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی ، صحابہ کرام اور تابعین کی زندگی سے ایسے اثرات ملتے ہیں جو تصوف کے ساتھ جوڑ کھاتے ہیں۔ ''اقبال اور مسلکِ تصوف'' میں ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> ''مختلف اسلامی اور غیر اسلامی عناصر و اثرات نے جس طرح مسلمان صوفیا، متصوفی اور حکما کے خیالات وافکار پر اثر ڈالا ہے اس کا اندازہ اسلامی تصوف کی تاریخ سے بخوبیہو سکتا ہے۔ رسولا کرم، صحابہؓ اور تابعینؒ کی زندگی میں صفائے قلب، سادگی، نیکی فقر و قناعت، استغناوتوکل، صبر وایثار، عبادت و ریاضت، ذکر و فکر کے بعض آثار موجو ہیں جنھیں اسلامی تصوف کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے''[۲۶]

مذہب تصوف سے متاثر نہیں ہوتا کیونکہ مذہب پہلے آتا ہے اور اسی مذہب میں سے صوفی پیدا ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ ہر دور میں جاری رہا ہے۔ تصوف اور مذہب کا آپسی ٹکراؤ نہیں ہے۔ جس طرح صوفی ایک حساس شخص ہوتا ہے بالکل اسی طرح تصوف بھی مذہب کے چند حساس جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس لیے مذہب اور تصوف کا ٹاکرا نہیں ہوتا بس یہ تو صرف چند کج ذہن لوگ ہوتے ہیں جو مذہب اور تصوف کو آمنے سامنے لاتے ہیں۔ مذہب اور تصوف کے حوالے سے محمد مختار خان غزنوی بشیر احمد ڈار کا ایک بیان نقل کرتے ہیں:

"کوئی مذہب تصوف سے متاثر نہیں چونکہ تصوف تاریخی طور پر بعد کی پیداوار ہے، واقعہ یہ ہے کہ تصوف مذہب کے محض جذباتی عناصر کو ایک علیحدہ اور منفرد شکل دینے کی کوشش کا نام ہے۔"[۲۷]

صوفی بھی اپنے نفس کے ساتھ اسی لیے جہاد کرتا ہے کہ وہ متقی بن جائے اور اسے رب کی قربت مل جائے۔ صوفی ہمہ وقت نفس کے تزکیے پر لگا رہتا ہے تاکہ وہ اپنے نفس کو اس قدر قابو میں کر لے کہ اس کا رب راضی ہو جائے۔ تزکیہ نفس کے حوالے سے رب کا قرآن کہتا ہے:

"اللہ ہی وہ ذات پاک ہے جس نے امیوں میں ایک عظیم المرتبت نبی مبعوث فرمایان جو انھیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، اوران کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے"۔۲۸

صاحب شریعت بندہ اللہ کو اس طرح پہچان لیتا ہے جس طرح پہچاننے کا حق ہے۔ ایک صاحب شریعت جب صوفی کے درجے تک پہنچ جاتا ہے تو وہ اس قدر کامل یقین والا بن جاتا ہے کہ اس کا ایمان کہتا ہے کہ جو غیب کی چیزین اور غیب کے مکین میں دیکھ سکتا ہوں اور دوسرے نہیں دیکھ سکتے۔ اس بات کی تصدیق میں خواجہ شمس الدینعظیمی لکھتے ہیں:

"علم شریعت اور علم حضوری سیکھنے کے بعد انسان کے شعور میں غیب پر یقین اور غیب کے مکینوں کو دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے"۔[۲۹]

تصوف کا علم یا حضوری ملنے کے بعد ایک صوفی اس جہاں سے نکل کر دیگر جہاں کی سیر کرتا ہے جہاں پہنچنا عام انسان کے بس کی بات نہیں۔ صوفی خود کو رب کے ذکر و اذکار کے لیے مختص کر دیتا ہے اور اس کے لیے دنیا کے مال و متاع کوئی معنی نہیں رکھتے کیونکہ اسلام میں بھی توکل اور بھروسے کی تلقین کی گئی ہے۔ اللہ نے اپنے نبی کو کہا"اے نبی ہم نے تمھیں متوکل بنا کر بھیجا"۔ صوفیا کرام کی بہت سی باتیں خاص لوگوں سے مختلف ہوتی ہیں اور صوفیا انھی باتوں کو اپنی عبادات کا صلہ اور رب کی خاص عطا سمجھتے ہیں۔

صوفیا کرام کا عرفانِ ذات حاصل کرنا، خدا کی حضوری میں خود کو ویسے پیش کرنا جیسے رب کو وہ پسند آجائیں پسندیدہ اشغال ہیں اور پھر انھی اشغال کے بل بوتے پر اسلام کے مطابق ایسے تذکیہ نفس کرتے ہیں کے خود کو عام مخلوق سے بلند تر درجے پر پہچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اس بات کو وہ اپنے لیے رب کا خاص انعام سمجھتے ہیں۔

ا۔ تصوف اور صوفی:

حضرت آدم علیہ کو تاریخ کا پہلا صوفی کہا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے سب سے پہلے اللہ کو اس طرح پہچانا جس طرح پہچاننا چاہیے تھا۔ قرآن اسلام اور ایمان کا تو ذکر اکثر مقامات پر ملتا ہے مگر "احسان" کا ذکر اس طرح نہیں ملتا ۔صوفیا حضرات احسان پر زور دیتے ہیں یعنی ان کا یقین اس خاص الخاص درجے پر موجود ہوتا ہے کہ ہم اپنی عبادات میں اپنے خدا کو دیکھ رہے ہیں۔ شیخ حفیظ الرحمن اپنی کتاب "تصوف اور صوفیا کی تاریخ" میں شاہ محدث دہلوی کے حوالے سے درج کرتے ہیں:

"تصوف بعرف شرع نام او احسان است" (ازالۃ الخفاء جلد ۲ ص ۱۴۲)

(تصوف کو عرفِ شرع میں احسان کہتے ہیں)"[۳۰]

صوفی اپنی ذات کو رد کر کے صرف خدا کی ذات کو ہر جگہ پاتا ہے۔ صوفی کا ہر کام اللہ کے لیے ہوتا ہے اور اپنے کام میں صرف اور صرف اللہ کی رضا چاہتا ہے۔ صوفی کی زندگی ظاہری زیب و آرائش سے پاک ہوتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اس کا باطن ایسے ہو جائے کہ اسے ہر وقت اللہ کی قربت میسر رہے اور وہ دیگر جہانوں کے بارے میں وسیع علم حاصل کر لے۔ صوفی چاہتا ہے کہ وہ ایک جگہ بیٹھے بیٹھے دیگر دنیاؤں کی بھی سیر کرے۔ صوفی کو ہر جگہ خدا نظر آتا ہے اور اس کا ہر کام اللہ کے لیے ہوتا ہے اس حوالے سے خواجہ شمس الدینعظیمی اپنی کتاب "احساناور تصوف" میں لکھتے ہیں:

"مظاہرِ فطرت، سمندر کی طغیانی اور سکون، اپنے آگے پیچھے اوپر نیچے۔۔۔ صوفی کو ہر طرف اللہ نظر آتا ہے"۔[۳۱]

صوفی اپنی ذات سے مستغنیٰ رہتا ہے اور اللہ تعالی کی ذات میں خود مستغرق رکھتا ہے اور صوفی اپنے سامنے آنے والی ہر بات اور فیصلے کو رب کی رضا سمجھتا ہے۔ صوفی ہر دور میں خود کو متغیر سے دور رکھتا ہے۔ صوفی زمانے

کے حالات کے مطابق خود کو تبدیل نہیں کرتا، اس کا مطلب یہ ہے کہ صوفی دنیا کے مال و متاع کی حوس نہیں رکھتا۔ صوفی کی ان خصوصیات کے حوالے محمد مختار خان غزنوی اپنی کتاب ''حقیقتِ تصوف'' میں لکھتے ہیں۔

''کہا جاتا ہے کہ صوفی وہ ہے جو ان احوال کی وجہ سے جو حق تعالی کی طرف سے اس پر ظاہر ہوں۔ اپنی ذات سے مستغنیٰ اور بے خبر ہوتا ہے۔ نیز کہا جاتا ہے کہ صوفی اللہ تعالیٰ کی تدبیر و تصرف کے سامنے مقہود ہوتا ہے اور عبودیت کے تصرفات کی وجہ سے مستور ہوتا ہے۔ نیز کہتے ہیں کہ صوفی میں تغیر نہیں آتا اور اگر آ بھی جائے تو اس میں میل نہیں ہوتا (پھر دل بھی صاف رہتا ہے)''۔ [۳۲]

۲۔ تصوف اور مولانا روم:

مولانا روم ۶۰۴ھ میں بلخ کے مقام پر شیخ بہاؤالدین کے گھر تولد ہوئے۔ مولانا کے والد اپنے وقت کے جید عالم تھے اور ان کی مقبولیت عوام میں ہی نہیں بلکہ خواص میں حد درجے تھی۔ عام روایات کے مطابق مولانا روم کا والد کی طرف سے سلسلہ نسب حضرت ابو صدیقؓ سے جاملتا ہے مگر اس روایت کو رینالڈ نکلسن نے صداقت سے دور قرار دیا ہے۔ نکلسن نے ''انتخاب دیوان شمس'' میں شمس اور رومی کے حوالے سے لکھا تھا جسے بعد میں عبد المالک آروی نے مرتب کیا:

"ڈاکٹر نکلسن آپ کے آبائی سلسلہ نسب کی روایت کو جس کے ماتحت آپ کا سلسلہ حضرت ابو بکر صدیقؓ خلیفہ اول تک منتہی (پہنچتا) ہوتا ہے غیر مستند اور ناقابلِ اعتبار بتاتا ہے۔" [۳۳]

شیخ بہاؤالدین کے ایک نہایت نیک دل اور مودب مرید سید برہان الدین محقق تھے۔ شیخ بہاؤالدین نے ان کی نیک دلی، علمی لگاؤ اور دوسروں کے لیے دلی تعظیم کو دیکھتے ہوئے مولانا کو ان کی تربیت میں کر دیا۔ سید برہان الدین ان کے اتالیق تھے اور استاد بھی تھے۔ مولانا روم نے انیس بیس برس تک تمام ابتدائی تعلیم سید برہان الدین سے حاصل کی۔ مولانا نے تقریباً پچیس برس کی عمر میں اپنے والد گرامی کے ساتھ قونیہ کا سفر کیا اور اس سفر میں بھی بہت سی نئی چیزوں سے واقفیت حاصل کی۔

۶۲۹ھ میں شیخ بہاؤالدین کی وفات کے بعد مولانا نے دمشق اور حلب کے سفر کا قصد کیا۔اس وقت ان شہروں کو علمی مراکز کی وجہ سے رشک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مولانا کو بچپن سے ہی علم کی دنیا میں مزید اور مزید کی راہ پسند تھی اس لیے مولانا نے حلب کا سفر کیا اور مدرسہ حلاویہ کے بورڈنگ ہاؤس میں قیام کیا۔ تحصیل علم کے شوق، طبیعت میں ذوق اور صحبت عمیق نے مولانا کی طبیعت میں علم کا وہ سمندر بھر دیا کہ جب بھی کوئی مسئلہ کسی سے حل نہ ہوتا تو وہ مولانا کی طرف ہی رجوع کرتے اور مولانا پل بھر میں اس کا حل بتا دیتے۔

قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر اور فلفسے جیسے علم نے مولانا کو ستاروں میں چاند کی حیثیت پر براجمان کر دیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے مولانا کی شہرت و مقبولیت دور دراز کے علاقوں تک پھیل چکی تھی۔ مولانا کو شیخ عطار کی کتاب ''اسرار نامہ'' سے خاص لگاؤ تھا اور اس نے بھی مولانا کی طبیعت میں تصوف کی طرف لگاؤ پیدا کر دیا تھا مگر مولانا کی طبیعت میں جو اصل اور بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی وہ شمس تبریز کی ملاقات سے ہوئی۔۶ ماہ تک جب دونوں بزرگ چلہ کشی کی حالت میں ایک کمرے میں بند رہے تو اس کے بعد مولانا روم ایک مکمل صوفی بن چکے تھے۔ایک صوفی کے لیے دینی علم نہایت ضروری ہے جو اس کی طبیعت میں اللہ سے محبت میں راست اور مدغم کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ شیخ حفیظ الرحمن اپنی کتاب ''تصوف اور صوفیا کی تاریخ'' میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ایک قول جو انھوں نے امام مالک کے حوالے سے نقل کیا، جس میں تصوف اور فقہ کی اہمیت ایک ساتھ واضح کی گئی ہے:

''جس نے فقہ کے بغیر تصوف حاصل کیا وہ زندیق ہوا اور جس نے تصوف سیکھے بغیر فقہ کا علم حاصل کیا وہ فاسق ہوا اور جس نے دونوں کو جمع کیا محق ہوا''۔[۳۴]

مولانا کی طبیعت اور قول و فعل میں امام مالک کے درج بالا قول کی مکمل عکاسی ملتی ہے۔ مولانا نے جب دین سیکھنے کی ٹھانی تھی تو سب سے بڑھ اس کو سیکھا اور جب تصوف کو طبعیت میں بھرنے کا وقت آیا تو اس کے لیے بھی دل و جان سے قربان ہو گئے۔

مولانا روم کی طبیعت میں شمس تبریز کی جدائی کے بعد جو دوسری بڑی تبدیلی رونما ہوئی اس نے مولانا کو شمس تبریز کی پیش بینی کے مطابق ایک شاعر بنا دیا۔ مولانا نے شمس تبریز کی جدائی میں حزنیہ غزلیں کہیں مگر مثنوی مولانا روم میں مولانا ایک عظیم مفکر، مذہبی رہنما اور قبول نظر صوفی نظر آتے ہیں۔

مولانا روم بااخلاق و باکردار اور سلسلہ باطنیہ کے صوفی بزرگ تھے۔ مولانا اب ایک سلسلہ کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اس سلسلہ صوفیا سے تعلق رکھنے والے دنیا کے ہر کونے میں موجود ہیں۔ ان کے سلسلے کے حوالے اسلامک سٹڈیز دہلی کے زیر اہتمام چھپنے والے "اسلام اور عصر جدید" خصوصی شمارہ نذر رومی میں مولانا شبلی اپنے مضمون "سوانح مولانا روم" میں لکھتے ہیں:

> "مولانا کا سلسلہ اب تک قائم ہے۔ ابنبطوطہ نے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے کہ ان کے فرقے کے لوگ جلالیہ کہلاتے ہیں۔ چونکہ مولانا کا لقب جلال الدینتھا۔ اس لیے ان کے انتساب کی وجہ سے یہ نام مشہور ہوا۔ لیکن آج کل ایشیائے کوچکمیں، شام، مصر اور قسطنطنیہ میں اس فرقے کو مولویہ کہتے ہیں"۔[۳۵]

مولانا روم طبعیت کے لحاظ سے نہایت سادہ، رحم دل اور شفیق تھے مگر مولانا کو مکمل طور پر پڑھنے اور ان کو سمجھنے کے لیے ان کا کلام موجود ہے جس میں، فیہفیہ، دیوان اور مثنوی جس نے مولانا کو آج تک زندہ رکھا ہوا ہے۔ مولانا روم کے دیوان میں زیادہ تر غزلیں ہی جن کے مقطع میں زیادہ تر شمس تبریز کا نام ملتا ہے۔ مختصراً مولانا کی طبیعت میں نیک دلی اور احسان کے آثار و جذبات تو بچپن سے ہی تھے مگر شمس تبریز کی صحبت سے مولانا تصوف کے حوالے سے بامِ عروج پر پہنچے۔

۳۔ تصوف اور شمس تبریز:

شمس تبریزی یا شمس الدین محمد ایران کے شہر سبز وار میں ۱۱۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام علاؤالدین مگر نفحات الانس میں علی بن ملک داؤدی لکھا ہوا ہے۔ آپ کا شجرہ مبارک حضرت جعفر سے ہوتا ہوا انیسویں پشت میں حضرت علیؓ سے جاملتا ہے۔ شمس تبریزی کی وفات ۱۲۴۷ء کو ایران میں ہوئی اور حال ہی میں ان کے مقبرے کو یونیسکو نے عالمی ثقافتی ورثے کے لیے نامزد کیا ہے۔ شمس تبریز کے ابتدائی تحصیل علم اور صحرانوردی کے حوالے سے مولانا شبلی نعمانی "سوانح مولانا روم" میں لکھتے ہیں:

> "شمس نے تبریز میں علم ظاہری کی تحصیل کی، پھر بابا کمال الدین جندی کے کے مرید ہوئے، لیکن عام صوفیوں کی طرح مریدی اور بیعت و ارادت کا طریقہ نہیں اختیار

کیا، سوداگروں کی وضع میں شہروں کی سیاحت کرتے رہے، جہاں جاتے کارواں سرا میں
اترتے اور حجرہ کا دروازہ بند کر کے مراقبہ میں مصروف ہوتے"[٣٦]

شمس تبریز، بابا کمال الدین جندی کے مرید تھے اور کمال الدین جندی بھی ایک حساس طبیعت کے مالک تھے ۔ شمس الدین نے شیخ رکن الدین سنجاسی اور ابو بکر زنبیل باف تبریزی کو بھی اپنا مرشد کہا ہے۔ان تمام بزرگوں کی تربیت اور طبیعت کا اثر شمس تبریز کی طبیعت میں واضح تھا مگر وہ خود بھی ایک باکمال صوفی بنے اور آدمی سے بڑھ کر انسان اور انسان سے انسانیت کو خوب پہچانا اور پھر انسانیت سے محبت کو اپنی زندگی کا مقصد عظیم بنا لیا۔ شمس تبریز نے ایک دفعہ دعا کی کہ یا اللہ مجھے کسی ایسے شخص سے ملا جو تجھے مانتا اور تیری مخلوق کو بھی پہچانتا ہو۔ ان کی اس دعا کے بدلے مولانا روم سے ملاقات ہوئی اور پھر دو سال تک قونیہ میں ان کے ساتھ رہے اور اس کے بعد دمشق چلے گئے۔ شمس تبریز اور مولانا روم کی محبت کے بارے میں عبد الرحمن جامی لکھتے ہیں:

"ممکن ہے آپ کو سب کی صحبت اور خدمت کی سعادت حاصل ہوئی ہو اور سب سے اکتسابِ فیض اور تربیت حاصل کی ہو۔ مولانا رومؒ کو آپ کے ساتھ کمالِ تعلق اور انتہائی خلوص تھا۔ ہمیشہ آپ کی صحبت میں حاضر رہتے تھے۔ آپکے اشعار میں ہر جگہ آپ کی تعریف موجود ہے اور رات و دن جلوت و خلوت اور صوم صلوٰۃ کی حالت میں اکثر صحبت میں حاضر رہتے تھے۔"[٣٧]

ناول "چالیس چراغ عشق کے" کے مطابق مولانا شمس تبریز سے مولانا روم کے مرید سخت نفرت کرتے تھے اس لیے انھوں نے ١٢۴٧ء کی شب کے آخری پہر شمس تبریز کو قتل کر ڈالا۔ اس قتل کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا کے مرید اور گھر والے سب شمس تبریز سے نفرت کرتے تھے کیونکہ مولانا ان کو وقت نہیں دے پاتے تھے اور گھر والوں اور مریدین نے وقت نہ دینے کا بدلہ شمس تبریز کو قتل کر کے لیا۔ مگر اس قتل کے بعد مولانا اکثر اداس اور پریشان رہ کر شاعری کرتے رہتے اور اپنی غزلوں میں اپنے مرشد شمس الدین کو یاد رکھتے۔

شمس تبریز تصوف میں ایک خاص مقام کے حامل تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو جس روحانی روشنی سے منور کر رکھا تھا وہ روشنی اللہ پاک کے خاص بندوں کا مقدر بنتی ہے۔ اس مقام کے حوالے سے عبد الرحمن جامی لکھتے ہیں۔

''یعنی وہ مولانا عزیز تر خیر کی طرف بلانے والے ارواح کا خلاصہ طاق اور شیشہ کے اوپر چراغ کے بھید ہیں۔ حق اور دین کے آفتاب اولین و آخرین میں خدا کے نور ہیں۔''[۳۸]

شمس تبریز کی طبیعت میں انسانیت کی محبت اس قدر تھی کہ وہ کسی شرابی یا طوائف سے اس لیے محبت کرتے تھے کہ اس کے اندر بھی ایک اچھا انسان موجود ہے مگر اسے ظالم دنیا نے اس راہ پر لگا دیا ہے اور یہ اپنی اصلی راہ بھول چکا ہے۔ شمس تبریز نے ایک دفعہ مولانا روم کو بھی شراب خانے بھیجا کہ جائیں وہاں سے شراب لے کر آئیں، مولانا روم ڈرتے ڈرتے گئے اور سب سے آنکھیں چراتے ہوئے جلدی جلدی لوٹ آئے۔ شمس تبریز نے مولانا روم کا یہ رویہ دیکھ کر کہا کہ جو شخص اپنے اندر سے مضبوط ہوتا ہے اسے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس طرح شمس تبریز اکثر ایسے لوگوں کی مدد کرتے جنھیں عام دنیا گناہگار سمجھتی تھی۔

۴۔ تصوف اور اردو ناول:

اردو میں ناول نگاری کے آغاز کا سہرا ڈپٹی نذیر احمد کے سر بندھا ہوا ہے۔ نذیر احمد نے ناول نگاری میں نصیحتی اور وصیتی انداز اپنایا ہوا تھا۔ مگر ۱۸۸۵ء میں فسانہ مبتلا لکھا اور اس ناول میں کچھ ایسے اثرات ملتے ہیں جو تصوف کے تحت آتے ہیں۔ نذیر احمد نے خالصتاً تصوف کے تحت کوئی ناول نہیں لکھا۔ مگر نذیر احمد کے باقی ناولوں میں تصوف کے اثرات ملتے ہیں جن میں، مراۃ لعروس، بنات النعش، توبتہ النصوح، فسانہ مبتلا، ابن الوقت، ایامی، رویائے صادقہ۔ ڈپٹی نذیر احمد کے بعد پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناول ''فسانہ آزاد'' میں بھی کچھ ایسے اثرات ہیں جو تصوف کی عکاسی کرتے ہیں۔ تاریخی ناول نگار، عبدلحلیم شرر کے ناولوں میں بھی تصوف کے نقوش موجود ہیں۔ عبدالحلیم شرر کے چند ناولوں کے نام، ملک العزیزورجنا،، حسن انجیلنا، منصور موہنا، فردوس بریں، فلورا فلورنڈا، ایامِ عرب، مقدس نازنین، فتح اندلس، یوسف و نجمہ، زوال بغدار اور طاہرہ یہ ناول ہیں جو تصوف کے نقوش لیے ہوئے ہیں۔ مذکورہ ناولوں میں سے "طاہرہ" میں تصوف کی روایت زیادہ مضبوط نظر آتی ہے۔

محمد علی طیب کا ناول "رام پیاری "اختر و حسینہ'' اور گورا میں تصوف کا عنصر موجود ہے۔ مرزا محمد سعید کے ناول، ''خوابِ ہستی'' اور'' یاسمین'' میں بھی تصوف کے اثرات موجود ہیں۔ پنڈت کشن پرشاد کول کا ناول ''شاما''

میں بھی تصوف کے چند نشان نظر آتے ہیں۔ پریم چند کے ناول ''گودان'' میں تصوف کے چند نشانات دیکھے جاسکتے ہیں۔

ا۔ اردو ناولوں کے کرداروں میں تصوف:

اردو ناول کی تاریخ میں ایسے ناول بھی ملتے ہیں جن کے کرداروں میں تصوف کے آثار ملتے ہیں۔ ان میں قرۃالعین کا ''آگ کا دریا''، ''آخر شب کے ہمسفر''۔ ممتاز مفتی کا ناول، ''علی پور کا ایلی''، ''الکھنگری''۔ جمیلہ ہاشمی نے ''دشت سوس'' نامی ناول لکھ منصور حلاج کے کردار کو تصوف کی دنیا میں حیاتِ جاودانی بخش دی۔ بانو قدسیہ کا ناول ''راجہ گدھ'' کا قیوم نامی کردار بھی تصوف کے اثرات اپنے اندر سموہوئے ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اردو ناول کی روایت میں تصوف چند پہلوؤں یا پھر کسی ایک پہلو کے ساتھ نظر آتا ہے۔ جس طرح ''دشت سوس'' میں جمیلہ ہاشمی نے تصوف کو بیان کیا ہے اس کی مثال خال خال نظر آتی ہے۔ اردو ناولوں میں کچھ مواقعوں پر تصوف اور شریعت متصادم بھی نظر آتے ہیں۔ آج کل تصوف صرف خانقاہوں تک ہی مقید و محبوس نہیں رہا بلکہ اس نے بھی سماج کے نظام میں ہی جگہ بنالی ہے۔ اردو ناولوں میں تصوف کی روایت کے حوالے سر رضا احمد اپنی کتاب ''اردو ناول میں تصوف کی روایت'' میں لکھتے ہیں:

> ''اس تناظر میں تصوف اور متصوفانہ اعمال و افکار کا عکس ہر اس فلسفہ، نظریہ اور مذہب میں نظر آتا ہے جس میں قادر مطلق کا تصور موجود ہے۔ دورِ جدید میں تخلیق کیے گئے ناولوں کے تجزیے سے ظاہر ہے کہ ان تخلیقات کو تصوف نے کئی پہلوؤں سے متاثر کیا ہے۔ اولاً ان ناولوں میں تصوف ایک طرز زندگی کے طور پر قابل عمل نظریہ تسلیم کیا گیا ہے۔''[۳۹]

جدید ناولوں کی مثال عمیرہ احمد کا ''پیر کامل'' اور قیصر حیات کا ''ذات کا سفر'' اور راحت سلطانہ کا ''سچل'' میں تصوف چائے میں چینی کی طرح حل شدہ نظر آتا ہے۔ اردو ناولوں میں تصوف کی باقاعدہ روایت ویسے نظر نہیں آتی کہ پورے پورے ناول ہی تصوف کے تحت لکھے گئے ہوں یا لکھے جارہے ہوں البتہ تصوف کی جھلک یا کرداری آثار ضرور نظر آتے ہیں

حوالہ جات

۱۔ Collins Cobuild,AdvancedLearner,s English Dictionary,Harper Collins Publishers Great Britain,2006,p-277

۲۔شان الحق حقی، فرہنگِ تلفظ، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء ص ۲۲۹

۳۔ سوزن بیسنٹ، ترجمہ توحید احمد، تقابلی ادب: ایک تنقیدی جائزہ، پورباکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء ص ۵

۴۔ www.merriam.webster.com/dictionary/comparative literature,p22.

۵۔ www.wikipedia.org>wiki>comp

۶۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی (مرتبہ)، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء ص ۹۶

۷۔ سوزن بیسنٹ، (مترجم) توحید احمد، تقابلی ادب: ایک تنقیدی جائزہ، پورباکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء ص ۸

۸۔ ایضاً ص ۹

۹۔ ایضاً ص ۱۱

۱۰۔ ایضاً ص ۳۲

۱۱۔ ایضاً ص ۳۳

۱۲۔ روشین امجد، فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید کا نسائی تصور (تقابلی مطالعہ)، نمل، اسلام آباد، ۲۰۱۸، ص ۴

۱۳۔ محمد حسین آزاد، آبِ حیات، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۱، ص ۸۵

۱۴۔ ایضاً ص ۱۹۴

۱۵۔ مولانا شبلی نعمانی، موازنہ انیس و دبیر، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۹۰۷، ص ۲۳۷

۱۶۔ وقاص خان، اردو سے اردو آف لائن ڈکشنری اور اصطلاحات، س ن

۱۷۔ آل احمد سرور، اقبال اور تصوف، لبرٹی آرٹ پریس، نئی دہلی، ۱۹۸۰، ص ۱۳

۱۸۔ اے۔ جے آربری، صفیازم، کوسموپبلیکیشنز، نیو دہلی، ۲۰۰۳، ص ۸

۱۹۔ محمد مختار خان غزنوی، حقیقتِ تصوف، میاں خیل پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۱۵ ص ۱۴

۲۰۔ ایضاً ص ۱۴

۲۱۔ ایضاً ص ۱۵

۲۲۔ ایضاً ص ۱٦
۲۳۔ اے۔ جے آربری، صفیازم، کوسمو پبلیکیشنز، نیو دہلی، ۲۰۰۳، ص ۱۴
۲۴۔ خواجہ شمس الدین عظیمی، تصوف، ص ۱۵
۲۵۔ Collins Cobuild,AdvancedLearner,s English Dictionary,Harper Collins Publishers Great Britain,2006,p1449
۲٦۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، اقبال اور مسلکِ تصوف، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۷، ص ۳۵
۲۷۔ محمد مختار خان غزنوی، حقیقتِ تصوف، میاں خیل پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۱۵، ص ۷
۲۸۔ القرآن، سورہ جمعہ، آیت ۲
۲۹۔ خواجہ شمس الدینعظیمی، احسان و تصوف، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاؤالدینذ کریایونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰٦، ص ۳۷
۳۰۔ شیخ حفیظ الرحمن، تصوف اور صوفیا کی تاریخ، شاکر پبلی کیشنز، لاہور، ص ۱۴
۳۱۔ خواجہ شمس الدین عظیمی، احسان و تصوف، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاؤالدین ذکریایونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰٦، ص ۲۹
۳۲۔ محمد مختار خان غزنوی، حقیقتِ تصوف، میاں خیل پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۱۵ ص ۲۲
۳۳۔ عبدالمالک آروی، شمس و رومی (مرتبہ) زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۴، ص ۳۲
۳۴۔ شیخ حفیظ الرحمن، تصوف اور صوفیا کی تاریخ، شاکر پبلی کیشنز، لاہور، ص ۱۴
۳۵۔ پروفیسر مشیر الحسن، اسلام اور عصرِ جدید، لبرٹی آرٹ پریس، دریا گنج نئی دہلی، دہلی، ۲۰۰۷، ص ۲۰
۳٦۔ مولانا شبلی نعمانی، سوانح مولانا روم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹٦۱ء، ص ۱۲
۳۷۔ راجہ طارق محمود، سوانح حیات شمسُا المعارف، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۲، ص ۳۵
۳۸۔ ایضاً ص ۳۴
۳۹۔ رضا احمد، اردو ناول میں تصوف کی روایت، اورینٹل کالج جامعہ پنجاب، لاہور ص ۴۹۰

باب دوم: ایلف شفق کے ناول "چالیس چراغ عشق کے" کا جائزہ
(تصوف کے تناظر میں)

ایلف شفق کا تعارف

ایلف شفق ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو سترا سبرگ، فرانس میں پیدا ہوئیں۔ ایلف شفق ایک سال کی تھیں جب ان کے والدین کے درمیان علیحدگی ہوگئی اور ایلف شفق کو ان کی والدہ شفق اتیمان اپنے ساتھ لے کر ترکیا آگئیں اور اس طرح ان کی پرورش ان کی والدہ نے کی۔ ایلف شفق نے سیاست کے مضمون کے ساتھ ترکی میڈل ایسٹ ٹیکنکل یونیورسٹی سے بے۔اے کیا اور پھر بعد ازاں مطالعہ نسائیت پر ایم اے اور پی ایچڈ کی۔ ایلف شفق نے انگریزی اور ترکی زبانوں میں لکھا اور دونوں میں برابر مقبولیت حاصل کی۔ ایلف شفق نے جہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کی وہیں مشاہداتی طور دنیا کی سیر بھی کی اور اس حوالے سے ان کی تحریریں اس بات کی عکاس بھی ہیں۔ ان کے تعارف اور ناول نگاری کے حوالے بلی گرے اپنے مقالے میں لکھتے ہیں:[1]

"ایلف شفق ایک ترکی سفارتکار کی بیٹی ہیں جنھوں نے انگلش اور ترکی دونوں زبانوں میں لکھا اور خوب نام کمایا۔ وہ فرانس کے شہر ستراس برگ میں پیدا ہوئیں اور اپنا زیادہ تر وقت میڈرڈ میں گزارا اور پھر کچھ وقت کے لیے امریکہ میں بھی مقیم رہیں اور آجکل انگلینڈ کی جامعہ آکسفورڈ سے وابستہ ہیں"۔

ایلف شفق بحیثیت ناول نگار دنیا بھر میں اپنی پہچان آپ ہیں۔ ان کی قابلیت اور پسندیدگی کا یہ عالم ہے کہ ان کے پہلے ہی ناول "Pinhan" پر ان کو رومی پرائزسے نوازا گیا ہے۔ پہلے ناول اور اس پر ملنے والے پرائز سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کا تصوف کی طرف رجحان تھا۔ ترکی میں رومی پرائز ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جن کی تحریریں تصوف کے دائرے میں آتی ہیں۔ اس حوالے سے فرخ سہیل گوئندی لکھتے ہیں:

"ایلف شفق ترکی کی مقبولِ عام ادیبہ ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں میں پیش کردہ

---

[1] "Shafak,who writes in both Turkish and English,is the daughter of a Turkish diplomate. She was born in Strasbourg and spent her formative years in Madrid, before moving for a short period to the United States. She currently resides in Oxford, England."۱

مشرق اور مغرب کے خوبصورت امتزاج کے باعث دنیا بھر میں معروف
ہیں۔ناقدین کے مطابق وہ ہم عصر ترکی ادب اور عالمی ادب میں ایک جداگانہ
آواز ہیں۔ان کی تحریروں کے موضوعات میں خواتین، حقوقِ نسواں، اقلیتیں
، تارکین وطن اور ان کے مسائل، متنوع ثقافتیں، ثقافتی سیاست، تاریخ، فلسفہ
اور خصوصاً صوفی ازم سرِ فہرست ہیں۔"۲

ایلف شفق نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک صحافی کی صورت میں کیا۔ایلف شفق تعلیم و تدریس کے حوالے مشی گن یونیورسٹی اور یونیورسٹی آف ایریزونا سے وابستہ رہیں۔ایلف شفق نے کچھ عرصہ امریکہ میں بھی گزارا اور اس بعد آکسفورڈ سے وابستہ ہو گئیں۔ایلف شفق انگلش اور ترکی دونوں زبانوں میں برابر لکھ رہی ہیں ان کو پوری دنیا میں مقبولیت حاصل ہے۔ایلف شفق کے مذکورہ ناول "چالیس چراغ عشق کے" کی اہمیت بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔اس ناول میں ایلف شفق نے مولانا جلاالدین رومی اور مشہور صوفی شمس تبریز کے ذریعے محبت کے چالیس اصول بیان کیے ہیں۔اور اس ناول کی اہمیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب تیرھویں صدی کے مشرقی تصوف کو اکیسویں صدی کے مغربی دائرے کے ساتھ جوڑتی ہیں۔اس ناول کے تیرھویں صدی اور اکیسویں کے تصوف کے جوڑ کے حوالے سے طولبا محمد امینی اپنے ایم اے کے مقالے میں لکھتے ہیں[2]:

در حقیقت ان وواقعات میں نہ صرف دو صدیوں کا تعلق ہے بلکہ

"تاریخی اور مذہبی واقعات کے ذریعے ایک دوسرے سے مشابہت کے ذریعے جڑے ہوئے ہیں۔شمس تبریز اور مولانا جلال الدین رومی کا رشتہ تیرھویں صدی میں تھا اور اکیسویں صدی میں ایلا اور اے عزیز ظہارا کی صورت میں دوبارہ وقوع پزیر ہوا۔اکیسویں صدی میں ایلا رومی کے مشابہ اور اے عزیز ظہارا شمس تبریز کی روح لے کر دوبارہ دنیا میں آتے ہیں۔اس ناول میں اے عزیز ظہارا کو جدید شمس تبریز کے طور پر دکھایا گیا ہے"۔

[2]أ"In fact, not only do the two centuries related to each other via the historical and religious events. They are also associated through the analogy betweenThe relationship between shams of Tabriz and jalaludinRumi and the one between Elle and aziz,respectively. In The 13thC Jalaludin was influenced by Shams while in The 21stC, is Elle is influenced by Aziz. So, Elle issimilar to Rumi and Aziz can be depicted as a modern Shams".۳

ایلف شفق نے تصوف کی دنیا کا ایک اہم واقعہ جو شمس تبریز اور مولانا روم کے نام سے مشہور ہے اس واقعے کو موجودہ دور کے ایلا اور عزیز کے ساتھ جوڑ کر اس بات کی اہمیت کو واضح کیا ہے کہ موجودہ دور میں بھی انسانیت کو محبت کی اشد ضرورت ہے۔" چالیس چراغ عشق کے "ادبی دنیا میں نہایت اہمیت کا حامل ناول ہے۔اس کی اہمیت کے حوالے سے بلی گرے لکھتے ہیں[3]:

"محبت کے چالیس چراغ بلاشبہ ان میں سے ایک زیادہ نمایاں اور
تجارتی لحاظ سے کامیاب تعاون ترین ناول ہے امیر اال زینے
اسے رومی رجحان قرار دیا ہے"۔۳

ایلف شفق نے اس ناول کے لکھنے سے پہلے تصوف کے متعلق پڑھا اور پھر اس حوالے سے ذہن میں خاکے بنائے۔ایلف شفق کا تصوف سے اور صوفیا کی سرزمین سے تعلق توازلی تھا اور پھر مغرب میں آنکھ کھولی تو اس طرح تو مختلف ثقافتوں کی مہک ان کے خون میں شامل ہوگئی۔ تصوف پر قلم اٹھانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں کیونکہ لکھنے والا براہِ راست مذہب کی زد میں آجاتا ہے۔ایلف شفق نے بھی سوچا ہو گا کہ کس طرح تصوف کے اصولوں کو موجودہ دور کے شدت پسند مذہبی اور سماجی لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے ۔ایسا ناول جو ایک ساتھ مشرقی اور مغربی عوام کو مذہبی حدود سے بالاتر ہو اپنی لپیٹ میں لے اور تمام انسانوں کے دلوں میں گھر کر جائے۔ناول ماضی اور حال کو جوڑ دے۔یہ ناول جامعیت کے لحاظ سے اپنی نوعیت کا ایک منفرد ناول بنے۔ایلف شفق نے جس قدر سوچ بچار کے بعد یہ ناول لکھا کہیں اس سے بڑھ کر اس نے مقام پایا۔ایلف شفق کے ناول لکھنے سے پہلے سوچنے کے متعلق بات کو قاسم یونیورسٹی (سعودیہ) کی ڈاکٹر عفرین فیاض اپنے ایک مضمون میں نقل کرتی ہیں[4]:

"میں نے کہا" جیسا میں ناول لکھنا چاہتی تھی اس کے لیے ایک خاص
ترتیب اور انہماک کی ضرورت تھی۔میں نے کئی بار سوچا اور کئی سطحوں

---

[3]أ"The Forty Rules of Love is undoubtedly one of the
More prominent and commercially successful contri-
Butions to what Amira El Zein has called the Rumi
Phenomenon."۴

[4]أ"I have longed to write a novel like "Ask," for a But I had t reach a certain level of maturity in orderTo actually write it. This novel went through manyStages. I wanted to discuss " Love with its divine And Human dimensions. West and East, Past and
Present"۵

سے گزر کر اس سطح تک پہنچی اور اسی طرح یہ ناول بھی بہت سے مدارج
پر محیط ہے۔ در حقیقت میں خدا اور مخلوق کی محبت اور محبت کی مختلف جہتوں
کو بیان کرنا چاہتی تھی جس میں مشرق ماضی اور حال شامل ہے"۔ ۴

ایلف شفق کی ناول نگاری موجودہ دور میں اہم مقام حاصل کر چکی ہے۔ انھوں نے مشرق اور مغرب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پھر مشرقی اور مغربی رویوں کا بغور مشاہدہ کیا اور انھیں جس بات کی کمی نظری آئی وہ انسانیت کی قدر و قیمت اور انسانیت سے محبت ہے۔اس افراتفری کے دور میں محبت نامی چیز ناپید ہی ہوتی جارہیہے۔ ہر انسان جو بظاہر ایک پر سکون گھرانے میں زندگی گزارتا نظر آتا ہے وہ بھی اندرونی سکون اور اصل محبت سے عاری ہے۔ اس بات کو واضح کرنے کے لیے انھوں نے ایلا نامی ایک امریکن خاتون کو پیش کیا پھر اس کو اصل محبت سے واقف کروانے کے لیے اسے عزیز ظہارا نامی مسلم صوفی سے واقف کروایا جو ایلا کے لیے اصل محبت اور روحانی سکون کا باعث بنتا ہے۔

ایلف شفق کے مذکورہ ناول کو اردو میں بھی بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ "چالیس چراغ عشق کے" کا اردو ترجمہ ہما انور نے کیا۔ "چالیس چراغ عشق کے" بیرونی صفحے پر ناول اور اس کی مصنفہ کے حوالے سے سہیل گوئندی لکھتے ہیں:

"ایلف شفق کو ان کے ناول "The Forty Rules of Love" پر عالمی
شہرت حاصل ہوئی۔ "چالیس چراغ عشق کے" اسی ناول کا ترجمہ ہے جو ترکی
زبان میں "Ask" کے نام سے لکھا گیا تھا۔ ناول کی کہانی حقیقت اور تخیل کا امتزاج
ہے اور معروف صوفی شاعر جلال الدین رومی اور درویش شمس تبریز کے گرد گھومتی ہے۔" ۵

ایلف شفق نے اپنے ناولوں میں فلسفہ، تاریخ اور تصوف کو ایک ساتھ ملا کر انسانیت کی آواز بنا کر ناول کی روح بنایا ہے۔ ایلف شفق کی آواز حقیقت کے قریب نظر آتی ہے اس لیے موجودہ دور کے قارئین کا محور بنی ہوئی ہیں۔

الف: مولانا روم اور شمس تبریز کی ملاقات

مولانا جلال الدین رومی نے ایک پاکباز گھرانے میں آنکھ کھولی تھی جس گھرانے کا ہر لمحہ ہی یہی کام تھا کہ وہ اپنی ذات کا تزکیہ کرتے رہتے تھے۔ مولانا پر اس تربیت کا یہ اثر ہوا کہ وہ علم اور شوق کی دنیا میں مزید سے مزید کے مبتنی ہو گئے، ہمہ وقت خود کو مصروف رکھتے اور بزرگوں کی عزت اور ان کی تعظیم کرنا انھوں نے اپنا ابتدائی فریضہ سمجھ لیا تھا۔ مولانا کو ان کے والدِ گرامی کے مرید سید برہان الدین نے دنیاوی علوم سے بچپن میں ہی سرفراز کر دیا تھا۔ مولانا بچپن میں اپنے والد گرامی کے ساتھ نیشاپور گئے تو وہاں پر ان کی ملاقات شیخ عطار سے ہوئی تو انھوں نے مولانا کے پُر جلال مستقبل کی نوید سنائی اور مولانا کو اپنی کتاب تحفے میں دی اور مولانا نے ہمیشہ شیخ عطار اور ان کی دی ہوئی کتاب کو دل میں جگہ دی۔ مولانا رومی سپیشل نمبر میں سید عابد علی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"شیخ بہاالدین جب نیشاپور پہنچے تو وہاں فرید الدین عطار سے ان کی ملاقات ہوئی۔ کہا جاتا ہے شیخ عطار نے مولانا جلال الدین رومی کو دیکھا تو ان کے پر جلال مستقبل کی پیش گوئی کی اور اپنی کتاب 'اسرار نامہ' بطورِ تحفہ عنایت کی۔ مولانا رومی اس کتاب کو حد درجہ عزیز رکھتے تھے۔"٦

مولانا رومی صوفیا میں سے شاید واحد بزرگ تھے علوم باطنی کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم میں بھی برابر کمال رکھتے تھے۔ ان کے علم کا چرچا قرب و جوار میں ہر جگہ پھیلا ہوا تھا۔ مولانا روم شہر کی جامعہ مسجد میں خطیب تھے۔ لیکن ان کی زندگی خاموش دریا کی طرح ایک عرصے تک چلتی رہی مگر اس ٹھہرے ہوئے دریا میں اس وقت پہلا انقلاب پیدا ہوا جب انھوں نے خواب دیکھنے شروع کیے۔ مولانا کی زندگی میں پہلی رمق اس وقت نمودار ہوئی جب انھوں نے چالیس دن تک مسلسل ایک ہی خواب دیکھا۔ مولانا رات کے پہر جب خواب دیکھتے تو ان کی حالت عجیب ہو جاتی اور ان کا چہرہ زرد پڑ جاتا۔ مولانا کی ایسی حالت پر ان کی بیوی کیرا اکثر جاگ جاتیں اور مولانا کو راحت محسوس کرنے کو کہتی مگر مولانا ان کو دوبارہ سونے کو کہتے اور خود اصل روشنی کی تلاش میں رہتے۔ اب مولانا روم کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہونے جا رہا ہے۔ اس حوالے سے محمد اکرم چغتائی اپنی مرتبہ کتاب میں لکھتے ہیں:

"ان کی زندگی کا دوسرا دور درحقیقت شمس تبریز کی ملاقات سے شروع ہوتا ہے ۔۔۔ یہ عجیب بات ہے کہ شمس تبریز کی ملاقات کا واقعہ مولانا کی زندگی کا سب سے

بڑا واقعہ ہے۔ تذکروں اور تاریخوں میں اس قدر مختلف اور متناقض طریقوں سے
منقول ہے کہ اصل واقعہ کا پتہ لگانا مشکل ہے۔"۷

مولانا خواب میں اپنے مرشد کو دیکھ رہے تھے مگر سمجھ نہیں پارہے تھے کہ آخر یہ ماجرہ کیا ہے۔ چالیس دنوں سے جب وہ مسلسل ایک سا ہی خواب دیکھتے آرہے تھے تو پھر اس کی تعبیر کیا تھی اور ایسا کیوں تھا ان سب سوالوں نے مولانا کو پریشان کر رکھا تھا یا وہ اپنے مرشد کے قریب تر ہوتے جارہے تھے۔ ان سوالوں کا جواب مولانا بھی ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ مولانا چالیس دن سے جو خواب دیکھتے آرہے تھے وہ ایک ہی خواب تھا اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔ مولانا خواب میں ایک شمع دان میں پانچ شمعیں جلتی ہوئی دیکھتے ہیں اور خود تلاوت کر رہے ہوتے ہیں۔ مولانا قرآن کی تلاوت سنانے کے لیے جب بزرگ کی طرف بڑھتے ہیں تو ان پر ایک راز افشاں ہوتا ہے جو مولانا کی اصل قسمت تھا۔ ایلف شفق لکھتی ہیں:

"تھوڑی دیر بعد میں نے درویش کو وہ آیت مبارکہ دکھانے کو سر اٹھایا جو میں
پڑھ رہا تھا اور تبھی مجھے یہ مرعوب کن ادراک ہوا کہ جسے میں نے شمع دان سمجھا
تھا، وہ اُس آدمی کا روشن دایاں ہاتھ تھا۔ وہ اپنا ہاتھ میری طرف کھولے ہوئے
تھا جس کی پانچوں انگلیاں فروزاں تھیں۔"۸

یہ وہ پہلی جھلک تھی جس کے متعلق مولانا کے استاد سید برہان کہا کرتے تھے کہ تم اللہ کے پیارے بندے ہو اور تمھیں اللہ اپنے عظیم کام کے لیے منتخب کرے گا۔ مولانا ہمیشہ اپنی خوش قسمتی پر فخر کرتے کہ مجھے میرے والد صاحب نے بہترین علوم سے منور کیا اور پھر روحانی علوم بھی دنیا سے بڑھ کر میرا مقدر بنے۔ مولانا روم نے اس خواب کے بعد بیتاب ہو کر باہر اپنے محبوب کو تلاش کرنا شروع کر دیا اور بے ساختہ پکارنے لگے۔ لوٹ آؤ میرے محبوب۔ تم کہاں ہو۔

مولانا روم اس خواب کے بعد خود پر عجیب سی کیفیت محسوس کرتے ہیں مگر وہ جانتے تھے کہ مجھے ہمیشہ میری خواہش اور توقع سے زیادہ نوازہ گیا ہے تو اس خواب کو میں کیوں افسردگی سے جوڑوں۔ ایلف شفق بیان کرتی ہیں۔

"اس جیسے وقت مجھے اچانک خود پر اداسی کی کوئی لہر طاری ہوتی محسوس ہوتی

ہے، اگرچہ میں کبھی نہیں بتا سکتا کہ کیوں۔ میری زندگی مکمل اور بھرپور ہے
جس میں مجھے تین نعمتیں حاصل ہیں جو مجھے بے حد عزیز ہیں: علم، نیکی اور خدا
کی تلاش میں دوسروں کی مدد کی قابلیت۔"۹

مولانا روم کی طبیعت میں بچپن سے ہی کچھ نیا سیکھنے اور نیا کرنے کی خواہش موجود تھی اور پھر ان کے استاد نے بھی ان کے متعلق پیش گوئی کر دی تھی ایک دن تم خدا کے پیارے بندوں میں شامل ہو جاؤ گے اور خدا کی دوسری مخلوق کی بھلائی کے لیے سرگرداں ہو جاؤ گے۔ مولانا کی طبیعت میں رمق تو بچپن سے ہی تھی مگر اس رمق نے زور اس وقت پکڑا جب خوابوں نے مسلسل ان کا پیچھا کرنا شروع کر دیا اور پھر ایک رات تو اپنے محبوب مرشد کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں اور پھر ان کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں اور مارے مارے پھرتے ہیں۔ جس چیز کی تلاش کی جائے آخر وہ مل ہی جاتی ہے۔ اس تلاش میں بھی رومی کا اپنا ہی قول صادق آتا ہے کہ عاشق صادق کو جیسے اپنے محبوب کی طلب ہوتی ہے ایسے ہی محبوب کو بھی اپنے عاشق سے ملنے کی طلب اور تڑپ ہوتی ہے۔ اس طلب کے تحت شمس تبریز بھی اپنے عاشق مولانا روم کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ شمس تبریز اپنے عاشق رومی کے لیے کہتے ہیں:

"ایک اور روز باقی ہے کہ میں اپنے ساتھی، اپنے رفیق سے ملوں گا۔ میں سو
نہیں پا رہا۔ اوہ رومی! الفاظ و معانی کی سلطنت کے بادشاہ! کیا تم جب مجھے
دیکھو گے تو پہچان لو گے؟ مجھے دیکھو!"۱۰

مولانا روم ہی نہیں بلکہ ان کے مرشد بھی ان کے لیے تڑپ رہے تھے اور مولانا شمس طویل سفر طے کر کے مولانا روم کی جامع مسجد کے باہر قونیہ آموجود ہوئے۔ مولانا کا خطبہ سننے کے بعد مسجد کے باہر وہ مولانا کا انتظار کرنے لگے مولانا جب مسجد سے نکلتے تھے تو ایک طویل ہجوم ان کے ساتھ ہوتا تھا اور اس ہجوم کے ہوتے ہوئے کسی کو بھی مولانا کے قریب ہونا یا ان سے ملنا مشکل تھا۔ شمس تبریز ایک درویش کا روپ دھارے ہوئے جب مولانا روم کے قریب ہوتے ہیں تو پہلی برکت اس وقت سامنے آتے ہی جب ڈرا ہوا گھوڑا درویش کے ہاتھ چھوتے ہی پرسکون ہو جاتا ہے۔ مولانا شمس تبریز نے پہلا سوال جب مولانا روم سے کیا کہ حضرت محمد ﷺ اور صوفی بسطامی میں سے کون عظیم ہے تو اس پر مولانا سخت حیران ہوئے اور ایک لمحے کے لیے شاید غصے میں آ گئے تھے۔ شمس تبریز تو وہ بزرگ تھے جن کا انتظار مولانا کو ایک مدت سے تھا اور مسلسل خواب میں ان کا مبہم سا دیدار کر رہے تھے اس لیے

یہ کوئی عام ہستی نہیں تھی اور انھوں نے مولانا روم کو اپنے دلیل پر مبنی جوابوں سے رضامند کر لیا اور مولانا روم پہلی دفعہ کسی شخص کے سامنے جھک رہے تھے اور وہ اتنے بڑے ہجوم کے سامنے جس میں مولانا روم کے عزیز ترین شاگرد بھی شامل تھے۔ اس واقعے کو ایلف شفق یوں بیان کرتی ہیں:

"کچھ دیر بعد ہمارے گرد موجود ہجوم میں گھبراہٹ بھری کھلبلی سی شروع ہوئی۔ انھوں مجھے اس سے پہلے کبھی کسی کے سامنے جھکتے نہیں دیکھا تھا اور یہ حقیقت کہ میں ایک سادہ سے سرگرداں درویش کے سامنے جھکا تھا، اس پر میرے قریب ترین شاگردوں سمیت کچھ لوگ سخت حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ ۱۱

شمس تبریز، مولانا روم سے اس ملاقات کے بعد جانے کے لیے اجازت طلب کرتے ہیں تو مولانا نے ان کو جانے سے روکا اور مزید ان کے ساتھ وقت بتانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ شمس تبریز نے اسی ملاقات میں جب اگلا سوال کیا۔

"اور آپ کے متعلق کیا معاملہ ہے عظیم مبلغ؟ مجھے بتایئے، آپ کا پیالہ کتنا بڑا ہے؟" ۱۲

یہ سوال کوئی عام سوال نہیں تھا بلکہ اس ملاقات کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے اور اسی سوال نے مولانا روم کو اپنے سحر میں لے لیا۔ مولانا روم جب اس سوال اور جواب کی محفل میں مطمئن ہو گئے تو انھوں نے شمس تبریز کو اپنے ساتھ لے جا کر مزید رازوں کو جاننے کی ٹھان لی۔

ا۔ مولانا رومی کی طبیعت میں تجسس کی جھلک:

اس سوال کے بعد مولانا روم جاگ گئے کہ ایک مدت سے میں جس مرشد ہستی کی تلاش میں تھا اور جس کو مسلسل خواب میں دیکھ رہا تھا یہ وہی ہستی ہے۔ وہ شمعیں اور شمع دان کی طرح روشن ہاتھ اور مبارک چہرہ مولانا کے سامنے موجود تھا۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی تلاش میں مولانا راتوں کو خود کو جگاتے اور بیتاب رکھتے تھے۔ آج اس ہستی کو سامنے پا کر مولانا کی خوشی کی انتہا نہ رہی:

"میں جان گیا کہ میں نے اپنا رفیق تلاش کر لیا تھا۔ لیکن خوشی و مسرت سے بے خود ہونے کی بجائے، جیسا کہ میں نے ہمیشہ خیال کیا تھا کہ ایسے موقع پر میں ہو جاؤں گا، مجھے ایک سرد سی دہشت اور رعب نے اپنی گرفت میں لے لیا۔" ۱۳

مولانا روم وہ جام پی چکے تھے جس کے لیے وہ ازل سے پیاسے تھے۔ مولانا روم گھر تشریف لائے تو شمس تبریز بھی ان کے ساتھ تھے اور گھر آتے ہی دونوں کتب خانے میں جا پہنچے اور کتب خانے کا دروازہ اندر سے مقفلکر لیا۔ مولانا روم کے گھر والے یہ صورتحال دیکھ کر بہت حیران تھے کہ اس سے پہلے تو مولانا نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ کسی درویش پر اس قدر فدا ہو جائیں اور پھر اُس کے لیے اپنے گھر والوں کی خبر تک نہ لیں۔

''سپہ سالار کا بیان ہے کہ چھ مہینے تک برابر دونوں بزرگ صلاح الدینزرکوب ک
ے حجرہ میں چلہ کش رہے۔ اس مدت میں آب و غذا قطعاً متروک تھی اور بجز صلاح
الدینکے کسی اور کو حجرہ میں آمد و رفت کی مجال نہ تھی۔''۱۴

مولانا روم کا بیٹا علاؤالدین شکار کے لیے گیا ہوا تھا اور وہ واپس آ کر کیا دیکھتا ہے کہ پورے شہر میں یہ خبر پھیلی ہوئی ہے کہ کل مولانا روم ایک درویش کے سامنے جھک گئے تھے اور پھر اسے ساتھ گھر بھی لے آئے تھے۔ مولانا کے گھر والوں میں ان کا یہ چھوٹا بیٹا سب سے زیادہ حیران اور غصے میں بھی تھا کہ میرے والد صاحب کسی وزیر یا بڑے آدمی کے علاوہ کسی کے سامنے یوں تو نہیں جھک سکتے، جھکنا بھی چھوٹی بات وہ ساتھ گھر لے آئے اور پھر کتب خانے میں بند ہیں۔ مولانا روم اپنے گھر والوں سے بے خبر اور کتب خانے میں بند ہو کر شمس تبریز سے کچھ مخفی راز سیکھنے میں مشغول رہتے۔ مولانا اور شمس تبریز جب کتب خانے میں بند تھے تو ان کی بات سننے اور ان کی کھوج لگانے کی کوشش علاؤالدین نے کئی بار کی مگر کچھ بھی نہ جان سکا اور پھر خود ہی کچھ سوچ لیا۔ مولانا روم اور شمس تبریز کا کتب خانے میں بند ہونے کا سلسلہ ایک دن سے جونہی آگے نکلا پھر چالیس دن تک جا پہنچا اور اس دوران مولانا روم اپنے گھر والوں سمیت اپنے شاگردوں اور مسجد کے خطبے تک کو بھول گئے۔ چالیس روز گزرنے بعد شمس تبریز مولانا روم کو کہتے ہیں کہ میں جو باتیں آپ کو سکھانا چاہتا تھا وہ سکھا چکا ہوں۔

''ہمیں یہاں گوشہ نشین ہوئے چالیس روز ہو چکے ہیں۔ ہر روز ہم نے مذہبِ
عشق کے چالیس اصولوں میں سے ایک پر بات کی۔ اب جب ہم یہ مکمل کر چکے
ہیں، میرا خیال ہے کہ ہمیں باہر نکلنا چاہیے۔ آپ کی عدم موجودگی ہو سکتا ہے
آپ کے خاندان کو پریشان کرے۔''۱۵

مولانا روم چالیس دن تک کتب خانے میں بند رہنے کے بعد جب باہر نکلے تو وہ جان گئے کہ علم صرف یہی نہیں تھا جو میرے پاس تھا بلکہ نفس کو پڑھنے کے لیے بھی سات منازل طے کرنی پڑتی ہیں مطلب نفس سے جنگ کی بھی سات منازل ہیں کہ کوئی انسان رشد و ہدایت اور انسانیت کے کونسے مرتبے پر فائز ہے۔ مولانا روم نے نفس کی سات منازل میں سے پہلی کو سادہ اور دنیا کا معمول قرار دیا کہ کچھ لوگ اکثر اسی منزل پر اٹک کر رہ جاتے ہیں اور ان کو نفس کی باقی منازل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی یا پھر وہ اس کی طرف جاتے نہیں ہیں۔ لیکن مولانا روم نے کہا کہ ایک صوفی کے لیے نفس کی منازل طے کرنا انتہائی ضروری ہے۔ جب ایک انسان نفس راضیہ سے گزر مرضیہ تک پہنچتا ہے تو انسانیت کے لیے مشعلِ راہ بن جاتا ہے۔ ساتویں اور آخری منزل نفس ذکیہ جس پر پہنچ کر انسان ایک کامل اور بے عیب انسان بن جاتا ہے۔ تذکیہنفس کی منزل وہ ہے جس کے لیے صوفیا کوشش کرتے ہیں اور پھر اس تک پہنچ بھی جاتے ہیں مگر اس تک رسائی کوئی آسان کام نہیں کیونکہ یہ دشوار اور خطِ مستقیم جیسے راستے پر چل کر ہی نصیب ہوتی ہے۔ مولانا روم کو چالیس دن کے بعد شمس تبریز کا کیا ہوا پہلا سوال یاد آتا ہے کہ آپ کا کیا معاملہ ہے مطلب آپ کا پیالہ کتنا بڑا ہے۔ اس سوال کے ذریعے وہ مولانا روم سے ان کے نفس کے بارے میں سوال کر رہے تھے۔

> "سو جب شمس تبریز نے مجھ سے وہ سوال پوچھا تو وہ صرف موازنے کی بات نہیں کر رہے تھے وہ چاہتے تھے کہ میں غور کروں کہ میں خدا کی راہ میں جذب ہونے کے لیے اپنی ذات کو فنا کرنے کی خاطر کتنی دور جانے تک آمادہ ہوں۔ اس سوال کے اندر ایک دوسرا سوال مخفی تھا۔"١٦

مولانا روم کو خدا تعالیٰ نے روحانی آنکھوں سے تو پہلے ہی نواز رکھا تھا اور مرشد کامل کے مل جانے اور مذہب عشق کے اصول پڑھنے کے بعد تو وہ نفس کی مزید اصلاح چاہتے تھے اور اس کے لیے وہ ہمہ وقت شمس تبریز کے ساتھ رہنا چاہتے تھے اور مزید سے مزید تر جاننے کے خواہاں رہتے تھے۔ کیمیا کا واقعہ بھی مولانا کی ابتدائی عمر میں خدا کا مقرب بننے کی طرف اشارہ ہے۔ کیمیا کے والدین اس بچی کی بے ہوشی کو ایک مرض سمجھے تھے مگر مولانا کی روحانی آنکھ نے کیمیا کو پہچان لیا اور اس کے والدین سے اس بچی کو اپنے ساتھ لانے کی اجازت مانگی تھی۔ مولانا کی اس صلاحیت کو ایلف شفق بیان کرتی ہیں:

"تمہاری بیٹی کمیا ایک غیر معمولی بچی ہے۔ اسے خداداد صلاحیت سے نوازا
گیا ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہو گی اگر اس انعام کی قدر نہ کی جائے۔
تمہیں اس کو مدرسے بھیجنا چاہیے۔۔"۱۷

مذہبِ عشق کے اصول پڑھنے کے لیے مولانا روم اپنے گھر والوں کو وقت نہیں دے پاتے تھے اور ان اصولوں کو سیکھتے ہوئے شاید وہ دینا بھی نہیں چاہتے تھے۔ مولانا روم نے شمس تبریز کی محبت میں اپنی بیوی کیرا سے بھی اتنی دوری اختیار کر لی تھی کہ وہ اکثر بے بس ہو کر کہتی کہ میں اپنی مقدس ماں سے دعا کروں کہ وہ میرا سہارا بنے۔

"سچ یہ ہے کہ جب سے شمس تبریز ہمارے گھر آئے ہیں، میں اس قدر رنجیدہ
اور الجھن زدہ ہوں کہ ہمیشہ سے زیادہ مقدس ماں کو چاہنے لگی ہوں۔"۱۸

مولانا روم اور شمس تبریز کو ایک کمرے میں اکٹھے ہوئے ایک موسم بیت چکا تھا مطلب سردی کا پورا موسم گزر چکا تھا اور بہار کا بھی آغاز ہو چکا تھا مگر اس طویل عرصے میں انھوں نے اپنی بیوی کی طرف ذرا بھی التفات کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

۲۔ مولانا رومی اور پوری دنیا ایک ہی دائرہ

مولانا روم نے شمس تبریز سے نفس کے تزکیے کے بعد انسانیت کی محبت کا درس بھی سیکھ لیا ہے۔ انسان خدا کی تلاش میں مکے مدینے اور مسجدوں میں جانے کے ساتھ ساتھ خدا کو انسانوں کے دل میں تلاش کرے اور یہی وہ مقام ہے جس کو پا کر انسان انسانیت کے بلند ترین مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ اکثر مذہب کا علم رکھنے والے جو شیلے علماء خود کو تلاش کرنے اور خدا اور انسان کی محبت میں غرق کرنے کی بجائے دوسروں کے ساتھ نفرت پر مبنی لڑائیاں اور مقابلے کرتے ہیں۔ جب ایک انسان دوسرے انسان سے بے لوث محبت کرنا شروع کر دیتا ہے تو پھر آخرت کے انجام سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جب ایک انسان ایک عام انسان کے درجے سے اٹھ کر صوفی کے درجے پر پہنچ جاتا ہے۔ ایک صوفی کی باقی خصوصیات کے ساتھ ساتھ ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ دنیا و آخرت کو لمحہ واحد موجود سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کے دل میں جب خدا کی محبت آ موجود ہوتی ہے تو پھر اسے گھبرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی سزا و جزا اسی دنیا میں اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ ایک صوفی کے نزدیک

جنت کی طلب ایک صلہ بن جاتی ہے اس لیے بھی وہ اپنی ہر محبت بغیر کسی صلے کی توقع رکھے کرتا ہے۔ ایک صوفی کا بہترین صلہ یہ ہے کہ اس محبت میں اس کی 'میں' بیرونی عناصر میں تحلیل ہو جاتی ہے اور پھر مزید اس کی کوئی میں نہیں رہتی جس کی حفاظت کے لیے وہ دنیا کے جاہ و جلال کا متمنیہو۔ مولانا رومی نے بھی اسی محبت کو دل میں بسا کر کہا تھا میں کسی مذہب سے تعلق نہیں رکھتا اور کوئی مخصوص خطہ مجھ سے منسوب نہیں اور میں کسی مخصوص قوم سے منسوب نہیں۔ مولانا رومی کہتے ہیں:

"نہ عیسائی نہ یہودی نہ مسلمان، نہہندو، بدھ، صوفی یا زین۔ کوئی مذہب یا
ثقافتی نظام نہیں۔ میں نہ مشرق سے ہوں نہ مغرب سے۔۔۔ میرا مقام
بے مقام ہے، ایک نشان جو بے نشان ہے۔"۱۹

مولانا روم اب خود کو ایک خوش نصیب اور حقیقت کو پا لینے والا شخص سمجھتے ہیں اور وہ اس بات کی قدر ہی نہیں کرتے بلکہ اس بات کو دل و جان سے تسلیم کرتے ہیں کہ یہ شمس تبریز ہی ہیں جنھوں نے میری زندگی بدل ڈالی میں ایک عام سی زندگی سے نکل کر زندگی کی اس درس گاہ میں داخل ہو چکا ہوں جہاں محبت کی تعلیم اس قدر وافر مقدار میں میسر ہے کہ انسان کو باہر کی دنیا کی محبت کی ضرورت نہیں رہتی۔ مولانا روم شمس تبریز کو اپنا مرشد ہی نہیں محبوب بھی مانتے ہیں۔ دنیا والے مولانا روم کے اس بزرگ کے بارے میں طرح طرح کے خیال رکھتے ہیں مگر مولانا روم، شمس تبریز کو اپنی زندگی کا حاصل اور پوری دنیا کی محبت کا نچوڑ کہتے ہیں۔

"میرے نزدیک وہ اُس محبت کا لب لباب یا نچوڑ ہیں جو پوری کائنات کو
حرکت دیتی ہے کبھی کبھار پس منظر میں پسپا ہو کر اور ہر شے یا ہر ٹکڑے کو
باہم جوڑ کر، کبھی کبھار پھٹ کر پرزے پرزے ہو کر۔ اس قسم کا اتفاق زندگی
بھر میں ایک ہی مرتبہ ہوتا ہے۔ اڑتیس برس میں ایک بار۔"۲۰

مولانا روم ایک سخت گیر عالم تھے مگر شمس تبریز کی صحبت میں آنے کے بعد وہ اس قدر بدل گئے کہ اب ان کو وہ میلے کچیلے لباس والے شرابی، طوائفیں اور بھکاری سب اچھے لگنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ مولانا جو موسیقی کو سخت ناپسند کرتے تھے مگر بعد میں ان کو اپنے محبوب مرشد کی نصیحت پر موسیقی بھی پسند آگئی۔ مولانا کی طبیعت میں آنے والی تمام تبدیلیاں شمس تبریز کی صحبت اور اثر کی وجہ سے نمو پزیر ہو رہیتھیں۔ موسیقی کے ساتھ ساتھ

شمس تبریز نے مولانا کے بارے میں کہا تھا کہ تم ایک اچھے شاعر بھی بن جاؤ گے اس محبت اور رفاقت میں وہ بات بھی سچ ہوئی۔ شمس تبریز مولانا روم کے لیے یک نعمت خداوندی تھے۔جب شمس تبریز مولانا رومی کو محبت کے اصول سکھا چکے تو وہ سمجھ گئے کہ اب وقت جدائی آگیا ہے۔اس بارے میں ایلف شفق لکھتی ہیں:

"اور اس کے ساتھ میرا خیال ہے کہ قونیہ میں میرے دن اب گنے جا چکے ہیں۔ ہر سچی محبت اور دوستی کسی غیر متوقع کایا پلٹ کی داستان ہے۔اگر محبت میں مبتلا ہونے کے بعد بھی ہم پہلے جیسے ہی رہیں تو اس کا مطلب ہے کہ محبت سچی نہیں۔شاعری، موسیقی اور رقص کی ابتدا کے ساتھ مولانا رومی کے قلب کے بدلنے کا بڑا حصہ مکمل ہوا۔"۲۱

مولانا روم نے شمس تبریز کی صحبت میں مذہبِ عشق کے اصول سیکھے اور یہ اصول کوئی عام اصول نہیں تھے بلکہ انسانیت سے محبت کی تدریس تھی۔

ب۔ عشق کی طرف جھکاؤ

مولانا رومی اور شمس تبریز کی ملاقات سے عاشق اور محبوب کے نام واضح ہوئے۔ عشق کے اصول واضح ہوئے۔ مطلب عشق صرف وہی نہیں جو سستی جذباتیت کے لیے کیا جائے بلکہ اصل عشق وہ ہے جہاں انسان دنیا کے نفع و نقصان کو بھول جائے۔ عشق انسان کو سچی، کھری اور قربانی دینے والی انسیت سکھا دیتا ہے۔ عشق انسان کو اصل زندگی کی طرف لوٹا دیتا ہے۔ عشق سے انسان میں قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔سچے عشق کی نشانی یہ ہے ہے جہاں عاشق کے دل میں تڑپ پیدا کرتا ہے وہیں محبوب کے دل میں بھی اپنے عاشق کے لیے بے پناہ محبت اور بیقراری پیدا کر دیتا ہے۔

مولانا روم جہاں اپنے اَن دیکھے محبوب کے لیے تڑپ رہے ہوتے ہیں وہیں محبوب بھی اپنے عاشق صادق کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اگر عشق سچا ہو تو شمس تبریز اور مولانا روم کی طرح خواب میں عاشق اور محبوب کو ایک دوسرے کے دیدار کروا دیے جاتے ہیں حتیٰ کے ایک دوسرے تک پہنچا بھی دیا جاتا ہے۔ مولانا شمس تبریز اپنے عشق کی تعبیر ایک خواب کے ذریعے دیکھتے ہیں کہ تم اپنے محبوب کو بغداد میں تلاش کرو:

''بغداد چلے جاؤ''۔میرے محافظ فرشتے نے سریلی گنگناتی آواز میں کہا۔

"بغداد میں کیا شے منتظر ہے؟" میں نے پوچھا۔ "تم نے ایک رفیق کے لیے دعا کی تھی اور ایک رفیق تمہیں عطا کیا جائے گا۔" ۲۲

شمس تبریز نے یہ دعا کسی عام شخص کے حصول کے لیے نہیں مانگی تھی بلکہ ایک عالمِ دین مطلب مولانا روم کے لیے مانگی تھی۔ شمس تبریز چاہتے تھے کہ وہ اس شخص کی نبض پر ہاتھ رکھیں گے تو وہ شخص دنیا کے لیے ہدایت کا روشن چراغ بن جائے گا۔ دوسری طرف مولانا روم بھی اپنے محبوب کے لیے تڑپ رہے ہیں اور وہ بھی ان کی شدید کمی محسوس کر رہے ہیں۔

"پھر کیوں مجھے اپنے اندر یہ خالی پن، یہ خلا محسوس ہوتا ہے جو ہر گزرتے دن کے ساتھ گہرا اور وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے؟ یہ کسی بیماری کی طرح میری روح کو مسلسل کترتا ہے اور جہاں کہیں میں جاؤں، میرے ہمراہ رہتا ہے۔" ۲۳

ا۔ ایلا اور عزیز کا عشق

ایلا شادی شدہ خاتون ہونے کے باوجود بھی کسی ان دیکھے شخص کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے اور اس عشق میں گرفتاہونے کی وجہ بھی مولانا روم کی نظموں کا مطالعہ ہے۔ اس خاتون کے عشق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عشق میں ہم مذہب، ہم ذات یا ہم وطن ہونا ضروری نہیں۔ عشق میں عمر کی بھی قید نہیں اور زندگی کی کیفیت کی کوئی شرط نہیں۔ ایلا بھی یہ جانتی تھی کہ لوگ اس کو بری نظر سے دیکھیں گے کہ شادی شدہ خاتون نے اپنے عشق کے لیے اپنے خاوند اور بچوں کو چھوڑ دیا مگر وہ تو ایلا کا محبوب تھا اور کوئی بھی اپنے محبوب کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر سکتا ہے جیسے رومی نے اپنے محبوب شمس تبریز کے لیے اپنے بیوی بچوں اور اپنے عزیز طلبہ کو وقت دینا چھوڑ دیا تھا۔ ایلا کو اس کے دوست کہتے ہیں:

"کیا تم اپنے شوہر کو ایک ایسے شخص کے لیے چھوڑ رہی ہو جس کا کوئی مستقبل نہیں؟" اس کے دوستوں اور ہمسایوں نے اُس سے بار بار پوچھا تھا، "اور تمہارے بچوں کا کیا ہو گا؟ تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ تمہیں کبھی معاف کر سکیں گے؟" ۲۴

عشق ایک ایسا جذجہ جو اصولِ نقصان پر مبنی ہے یعنی اس میں اپنے محبوب کے حصول کے لیے ہر نقصان بھی چھوٹا اور کم لگتا ہے۔ ایلا نے بھی اس سودے کا آغاز نقصان سے ہی کیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے

بچے اور خاوند بھی ہے مگر اس عشق کے بدلے اسے ان سب کو چھوڑنا پڑے گا مگر اس نے یہ سب نقصان جانتے ہوئے بھی یہ سودا کیا۔ عشق میں جو سرور ملتا ہے اس کا اپنا ایک الگ ہی مزہ ہے۔ مگر اس عشق میں محبوب کے حصول سے پہلے کی کیفیت بھی بہت منفرد ہوتی ہے ۔انسان تنہائی محسوس کرنا شروع کر دیتا ہے اور اس کا جی کھانے، پینے اور کام کاج میں نہیں لگتا۔ اس تنہائی کے حوالے سے ایلا کہتی ہے:

"پھر ایلا نے سوچا کہ اگر شمس تبریز اس کے ہاتھ کی لکیریں پڑھتے تو وہ کیا دیکھتے۔ کیا وہ بتا پاتے کہ اس کا دماغ وقتاً فوقتاً تاریک سوچوں کی آسیبی آماجگاہ بن جاتا ہے؟ یا اتنا بھرا پڑا محبت کرنے والا خاندان ہونے کے باوجود اس قدر تنہائی کیوں محسوس کرتی تھی؟" ۲۵

ایلا اپنے اَن دیکھے محبوب کے تبصرے پڑھتی ہے اور اس کے بلاگ میں مولانا رومی کی نظمیں پڑھ کر اور گہرے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے ۔ آخر ایلا اپنے محبوب کو میل کرنے کا سوچتی ہے اور اس کو میل بھی کر دیتیہے۔ ایلا نے اس عشق میں گرفتار ہو کر ایک بار بھی نہیں سوچا کہ میں ایک گھرانے دار خاتون ہوں، اس طرح کسی کے عشق میں کیسے گرفتا ہو سکتی ہوں۔ یہاں پر عاشق صادق والی تڑپ نمایاں ہوتی ہے۔ ایلا اپنے محبوب کو ملنے سے پہلے ہی خواب میں ان کو دیکھ لیتی ہے۔ جس طرح رومی کی زندگی میں شمس کی کمی تھی اسی طرح ایلا کی زندگی میں بھی عزیز کی کمی تھی۔ ایلا کی زندگی میں جس چیز کی کمی تھی وہ محبت تھی اور وہ اس محبت کو پانے کے لیے عزیز کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ طولبا محمد المینی اپنے مقالے میں اس حوالے سے لکھتے ہیں[5]:

"دوسری طرف، ایلا اور رومی ایک عام زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن کچھ کمی ہے جو محبت ہے۔ دونوں ایک محبت کرنے والے ساتھی کی کمی محسوس کرتے ہیں۔ ایلا کی زندگی میں بہت سیچیزوں کی کمی ہے جن میں سے ایک محبت ہے"۔ ۲٦

---

[5]أ"On the other hand, Ella and Rumi live a normal lifeBut there is something missing which is love. Both Of them are in need of a companion of love. Ella,sLife lacks many things especially love."۲٦

طلب سچی ہو تو عاشق اور محبوب کا ملنا ضروری ٹھہر جاتا ہے بلکہ نوشتہ تقدیر پر لکھ دیا جاتا ہے۔ ایسے ہی یہ دو عاشق اور محبوب بھی ایک دوسرے پر فدا ہو چکے ہیں اور ایک دوسرے کو ملنے کے خواہاں ہیں۔ اِدھر ایلا نے خواب دیکھا اور اُدھر اے عزیز ظہارا نے ایلا سے ملنے آنے کا ارادہ پکڑ لیا اور ایلا کو آگاہ کر دیا۔

"عزیز نے کہا، جب لوگ غیر معمولی اور غیر متوقع حالات کے لیے تیار
ہو جائیں تو بے لگام خوابوں سے بھی آگے عجیب واقعات رونما ہوتے ہیں۔
لیکن ایلا اس سب کے لیے ذرہ برابر تیار نہ تھی جو ہوا: عزیز اے ظہارا
اس سے ملنے بوسٹن چلا آیا۔" ۲۷

ایلا اور اے عزیز ظہارا کا عشق کوئی عام یا جسمانی عشق نہیں تھا بلکہ شمس تبریز ایک بار پھر اے عزیز ظہارا کے روپ میں دنیا میں آموجود ہوا تھا۔ انسان اور انسانیت سے محبت اللہ کے بندوں کی ہر دور میں اور ہر خطے میں اولین ترجیح رہی ہے۔ اکیسویں صدی میں ایک بار پھر شمس تبریز انسان کو محبت کا درس دینے کے لیے آتا ہے۔ تیرھویں صدی میں یہی شمس تبریز رومی کے دل میں گھر کرتا ہے وہیں اکیسویں صدی میں شمس تبریز، اے عزیز ظہارا کی صورت میں ایلا کے دل میں گھر کرتا ہے اور ایلا اپنے خاوند کو چھوڑ کر اے عزیز ظہارا کے پاس جاتی ہے مگر وہ اس عورت سے کسی قسم کا کوئی جسمانی عشق نہیں کرتا بلکہ ایک روحانی عشق کرتا ہے۔ ایسی محبت کے حوالے سے حضرت علی ہجویریؒ اپنی کتاب کشف المحجوب میں لکھتے ہیں:

"دوسری قسم یہ ہے کہ ایک جنس کی محبت کسی غیر جنس کے ساتھ ہو۔ ایسی محبت اپنے
محبوب کی کسی صفت پر سکون و قرار حاصل ہونا ہوتا ہے تاکہ وہ اس خوبی سے راحت پائے
اور انس حاصل کرے۔ مثلاً محبوب کا کلام سننا یا اس کے دیدار کا خواہاں ہونا وغیرہ۔" ۲۸

شمس تبریز اور مولانا روم کا تعلق صرف ایک تعلق نہیں ہے بلکہ اس تعلق میں ایک جہان محفوظ ہے۔ جیسے شمس تبریز نے ایک مخلص دوست کے لیے دعا کی تھی بالکل اسی طرح ایلا بھی ایک سچی محبت کی مشتاق تھی اور وہ بھی چاہتی تھیں کہ ان کی زندگی میں ایک ایسا شخص آئے جو ان کی زندگی کو حقیقی معنوں میں محبت سے

آشنا کر دے۔ اے عزیز ظہارا جدید دور کا شمس بن کر ایلا کی زندگی میں داخل ہوا۔ طولبہ محمد المینی اپنے مقالے میں لکھتے ہیں:[6]

> "در حقیقت ان دو واقعات میں نہ صرف دو صدیوں کا تعلق ہے بلکہتاریخی اور مذہبی
> واقعات کے ذریعے ایک دوسرے سے مشابہت کے ذریعے جڑے ہوئے ہیں۔
> شمس تبریز اور مولانا جلال الدین رومی کا رشتہ تیرھویں صدی میں تھا اور اکیسویں
> صدی میں ایلا اور اے عزیز ظہارا کی صورت میں دوبارہ وقوع پزیر ہوا۔ اکیسویں
> صدی میں ایلا رومی کے مشابہ اور اے عزیز ظہارا شمس تبریز کی روح لے کر دوبارہ
> دنیا میں آتے ہیں۔ اس ناول میں اے عزیز ظہارا کو جدید شمس تبریز کے طور پر دکھایا
> گیا ہے۔"۲۹

صوفیا کا مذہب، مذہبِ عشق ہے اور تمام صوفیا ایک سلسلے کی کڑیاں ہوتے ہیں مطلب ایک ٹوٹی تو اس کی جگہ کسی دوسرے صوفی نے لے لی۔ جیسے رومی کے لیے شمس تبریز محبوب بن کر آتا ہے اسی طرح ایلا کے لیے اے عزیز ظہارا محبوب بن کر آتا ہے۔ اس حوالے سے رومی کہتے ہیں:

> "ہر صوفی جو مرتا ہے، اُس کی جگہ کہیں اور کوئی صوفی جنم لیتا ہے۔" ہمارا مذہب،
> مذہبِ عشق ہے اور ہم سب دلوں کی زنجیر کی صورت باہم جڑے ہوئے ہیں۔ اگر اور
> جب کوئی کڑی ٹوٹ جاتی ہے تو کہیں اور کسی دوسری کڑی کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہر شمس

---

[6] أ"In fact, not only do the two centuries related to

Each other via the historical and religious events.

They are also associated through the analogy between

The relationship between shams of Tabriz and jalaludin

Rumi and the one between Elle and aziz,respectively. In

The 13thC Jalaludin was influenced by Shams while in ۲۹

The 21st C, is Elle is influenced by Aziz. So, Elle is similarto Rumi and Aziz can be depicted as a modern Shams."۲۹

تبریز جو اس جہان سے گزر جائے، اس کی جگہ کسی مختلف زمانے میں، کسی مختلف نام
سے کسی نئے شمس کا ظہور ہو گا۔ نام بدل جاتے ہیں، لوگ آتے اور جاتے ہیں لیکن جوہر
اور روح وہی رہتے ہیں۔"۳۰

جیسے شمس تبریز اپنے محبوب مولانا رومی کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں ایسے ہی ایلا کا محبوب اے عزیز ظہارا بھی اپنی عاشق ایلا کو داغِ مفارقت دے جاتا ہے۔

"آدھے گھنٹے بعد جب وہ واپس آئی تو اسے کمرے میں ڈاکٹر اور ایک نوجوان نرس
سر پر سکارف اوڑھے ملے اور چادر عزیز کے سر تک کھینچی ہوئی تھی۔ وہ دنیا سے
گزر چکا تھا۔"۳۱

ایلا، اے عزیز ظہارا کے گزر جانے کے بعد زندگی کا تصور کرتی ہے کہ زندگی محبت کے بغیر خالی ہے جیسے گہرے نیلے رنگ کا لامتناہی آسمان ہے۔ ایلا کو بھی رومی کی طرح اے عزیز ظہارا کو کھونے کی فکر لگی رہتی تھی آخر وہ کیوں نہ ڈرتی کیوکہ جس زندگی کو اتنے سالوں بعد اس کے ارمان ملے تھے اب ایک بار پھر وہ ارمان مبہم ہو چکے تھے۔ ایلا اپنی بیٹی کو زندگی کی حقیقت بتاتی ہے اور کہتی ہے محبت کے بغیر اس زندگی کی کوئی اہمیت نہیں اور پھر مذہبِ عشق کا چالیسواں اصول بیان کرتی ہے:

"یہ اصول نمبر چالیس ہے۔" اُس نے آہستگی سے کہا، "محبت کے بغیر کوئی
بھی زندگی کسی شمار میں نہیں۔ خود سے مت پوچھو کہ تمہیں کیسی محبت کی جستجو
کرنی چاہیے، روحانی یا مادی، الوہی یا دنیوی، مشرقی یا مغربی۔۔۔ تقسیم مزید تقسیم
پر منتج ہوتی ہے۔ محبت کا کوئی نام نہیں، کوئی تعریف نہیں۔ یہ جو ہے بس وہی ہے،
خالص اور سادہ۔ محبت آبِ حیات ہے۔ اور محب روح آتش ہے! جب آتش،
آب سے محبت کرنے لگے تو کائنات مختلف طور پر محو گردش ہوتی ہے، ایک نئے
سانچے میں ڈھلنے لگتی ہے۔"۳۲

عمر مذہب اور رنگ نسل سے بالاتر ہو کر محبت ہی وہ محور ہے جہاں سب اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ محبت کے بغیر یہ جہاں جوں ہے جیسے بغیر روح کے جسم ہوتا ہے۔

۲۔ دنیا اصولِ محبت پر قائم

محبت ایک ایسا اصول ہے جس پر دنیا کی تمام بنیادیں ایستادہ ہیں اگر انسانوں میں سے محبت ختم ہو جائے تو دنیا کے تمام اصول اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ اس لیے ضروری ہے باقی بنیادوں کو محفوظ اور تادیر قائم رکھنے کے لیے محبت جیسی مرکزی بنیاد کو مضبوط رکھا جائے۔ خالقِ کائنات اپنی مخلوق سے محبت کرتا ہے اسی طرح مخلوق کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے خالق اور خالق کی باقی مخلوق سے محبت سے پیش آئے۔ شمس تبریز نے چالیس اصول جو مولانا روم کو سکھائے تھے ان میں سے پہلا اصول محبت کے حوالے سے ہی ہے۔

"یہ پہلا اصول ہے برادر۔ میں نے کہا، "ہم خدا کو کیسے دیکھتے ہیں، یہ اس بات کا براہ راست عکس ہے کہ ہم خود کو کیسے دیکھتے ہیں۔ اگر خدا کے نام پر ہمارے ذہن میں خوف و ملامت جمع ہو چکے ہیں۔ اگر ہم خدا کو محبت اور رحم سے بھرا دیکھتے ہیں تو ہم بھی ایسے ہی ہیں۔" ۴۳

محبت ایک بنیادی دائرہ ہے جس میں داخل ہو کر ہی انسان زندگی کی قدر و قیمت سے واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔ ایلا جب اے عزیز ظہارا کا بلاگ پڑھ رہی ہوتی ہے تو اس وقت اس بلاگ میں مولانا رومی ایک نظم پڑھتی ہے جس کے مطابق محبت کے بغیر زندگی ایک بوجھ ہے۔

"محبت کا انتخاب کرو محبوب!

محبت کی شیریں زندگی کے بغیر، جینا ایک بوجھ ہے۔۔۔

جیسا کہ تم دیکھ ہی چکے ہو۔" ۴۴

شمس تبریز نے مولانا روم کو چالیس اصولوں میں سے ایک اصول بتایا اصل غلاظت کے متعلق بتایا کہ ہم صرف بیرونی غلاظت سے نفرت کرتے ہیں حالانکہ یہ اصل غلاظت نہیں ہے بلکہ اصل غلاظت وہ ہے جس سے ہماری روح بھی غلیظ ہو جاتی ہے۔ ہم عبادات کے ذریعے جسم کی غلاظتوں کو تو دور کر سکتے ہیں مگر روح کی غلاظت کو دور کرنے کے لیے محبت جیسی غذا کی ضرورت ہے۔ اصل صفائی روح کی صفائی ہے جس کے لیے ہم کوشش نہیں کرتے۔

"اصلی غلاظت اندر ہوتی ہے۔ باقی سب تو آسانی سے دھل جاتا ہے۔ صرف

ایک قسم کا گرد وغبار اور داغ ہے جو پاک پانی سے بھی نہیں دھلتا اور وہ روح کو
داغ دار کرتا نفرت اور تعصب کا داغ ہے۔ تم اپنے بدن کو تو پرہیز گاری اور روزہ
رکھ کر پاک کر سکتے ہو مگر قلب کا تزکیہ کرنے والی شے صرف محبت ہے۔"۳۵

شمس تبریز نے اس محبت کی بے شمار مثالیں مولانا روم کو سکھائیں اور کچھ ان کے شہر میں ان کے سامنے قائم بھی کی ان میں سے ایک طوائف، گلِ صحرا بھی ہیں جو مسجد میں آئی مسجد والے لوگوں نے اسے دھر لیا اور اس پر طرح طرح کی زبان استعمال کرنے لگے۔ اس وقت بہت سے لوگ اسے مارنا چاہتے تھے جو شاید صرف اس کے ظاہری حلیے سے واقف تھے۔ اس کے ظاہری حلیے کو جاننے والے یہ بھی بھول گئے کہ اگر وہ یہاں بھیس بدل کر آئی ہے تو یقیناً اپنا دل صاف کر کے آئی ہو گی۔ اس ہجوم میں سے کسی کو بھی ہمدرد نہ پا کر شمس تبریز نے اس طوائف کو وہاں سب کے ستم سے بچا کر انسانیت سے محبت کا ثبوت دیا اور مثال قائم کر دی۔

"درویش نے طوائف کا ہاتھ تھاما اور اسے نوجوان لڑکے کے اور ہجوم سے
پرے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ ان کے پیچھے چھپ گئی، کسی ننھی بچی کی طرح
جو اپنی ماں کے لباس کے پیچھے چھپ رہی ہو۔"۳۶

۳۔ عورت محبت کا روپ:

عورت محبت کی علامت ہے اور محبت کی خوراک سے ہی تربیت حاصل کرتی ہے۔ عورت ہر روپ میں محبت کا پیکر ہوتی ہے۔ عورت کی محبت ایک ماہر استاد کی طرح ہے کیونکہ اس سے بہت سے لوگ تربیت حاصل کرتے ہیں۔ عورت ماں، بیٹی، بہن اور بیوی ہر روپ میں محبت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ عورت کی محبت کی اہمیت سب سے زیادہ اس وقت سامنے آتی ہے جب وہ کسی مرد کے لیے اپنی محبت کو قربان کرتی ہے اور پھر اس کو اپنا گرویدہ بناتی ہے۔ یہ عورت صرف مرد کو اپنا گرویدہ ہی نہیں بناتی بلکہ اسے بدلنے کی چاہت رکھتی ہے۔ اسی طرح کمیا بھی شمس تبریز کی محبت میں گرفتار ہو کر انھیں بدلنا چاہتی ہے۔

"میں کسی کے سامنے بھی اعتراف کر سکتی تھی کہ میں شمس تبریز سے
محبت کرتی تھی۔"۳۷

کمیا نے صرف اعتراف ہی نہیں کیا بلکہ ایک عزم بھی کیا کہ میں شمس تبریز کو اپنی محبت سے خابہ بدوشی سے روک لوں گی۔ جب کیرا نے کمیا کو روکا کہ آپ شمس تبریز کو سمجھا نہیں سکیں گی تو انھوں پر اعتماد جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں وہ بدل سکتے ہیں۔ میں نے مضبوط لہجے میں گویا بات ختم کی۔
اتنی محبت اور مسرتیں دوں گی کہ انہیں بدلنا ہی ہو گا۔ وہ ایک اچھا شوہر اور باپ
بننا سیکھ جائیں گے"۔۳۸

عورت اپنی ذات میں محبت کا ایک طوفان رکھتی ہے جب وہ اس طوفان کو اپنی ذات کی حدود سے باہر نکال دے تو پھر اس کے آگے کوئی بھی دیوار کھڑی کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس طوفان کے سامنے مرد بے بس اور ناتواں نظر آتا ہے۔ مگر یہ کمزوری نہیں بلکہ کسی بھی منزل تک پہنچنے کے لیے ایک سیڑھی ہے۔ کمیا کی طوفانی محبت کے بارے میں کیرا یوں اس کی تعریف کرتی ہے۔

"پھر میں نے کمیا سے مزید کوئی سوال نہ کیا، اس لیے نہیں کہ میں اس کے جوابات
سے قائل ہو گئی تھی بلکہ اس لیے کہ مجھے اس کی آنکھوں میں محبت گزیدہ عورت
دکھائی دے گئی تھی۔"۳۹

ایلا بھی ایک عورت ہے، جو اسلام نام کے مذہب سے تو واقف نہیں مگر روحانی سکون اور اصل محبت کو خوب جانتی ہے جو خاندان یا پیسے سے نہیں بلکہ کسی سچے دل سے ملتی ہے۔ کیرا بھی ایک عیسائی خاتون ہے جو مولانا روم جیسے عالم کی زندگی میں ان کی دوسری بیوی بن کر آتی ہیں اور ان کے لیے راحت کا باعث بن جاتی ہیں۔ کمیا بھی ایک عورت ہے جو شمس تبریز جیسے بزرگ کا کردار دیکھ کر ان سے لگاؤ پیدا کر لیتی ہے اور ان کے نام اپنی کمسن جوانی کر دیتی ہے۔

ج۔ شمس تبریز کا قتل

شمس تبریز کی طبیعت میں ایک ایسا سچ اور بہادری چھپے تھے کہ وہ صرف حق بات کہتے تھے اور یہ حق بات ہر کسی کے سامنے بغیر کسی خوف و حرص کے کہہ دیتے تھے۔ اس حق کو اس قدر بیباکی سے کہنے کے بدلے جہاں انھیں رب کی قربت اور انسانیت کے دلوں میں دخول کے مواقع ملتے گئے وہیں دنیاوی علم اور ظاہری شریعت کے

پابند لوگ ان کے مخالف بھی ہوتے گئے اور ان سے بغض رکھنا شروع کر دیا۔ شمس تبریز نے زندگی کے اس سفر میں جن جن شیوخ اور عالموں کا سامنا کیا ان کے حوالے سے وہ کہتے ہیں:

> ''اپنے تمام سفروں میں، میری ملاقات بہت سے شیوخ سے ہوئی۔ شمس تبریز نے کہا، کچھ مخلص تھے، دوسرے منکسر مزاج اور با اخلاق، اور انہیں اسلام کے بارے میں کچھ بھی علم نہ تھا۔ آج کل کے شیوخ کے سروں کے بدلے میں خدا کے سچے عاشقوں کے پرانے جوتوں کی دھول بھی نہ دوں گا۔ حتیٰ کے پردے کے پیچھے سایوں کی صورت کرتب دکھانے والے بھی ان سے بہتر ہیں کیونکہ وہ کم از کم یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ جو کچھ وہ دکھاتے ہیں وہ محض فریب نظر ہے۔''۴۰

علم کی دنیا کے خدا اور شریعت کے پاسبان تو شمس تبریز کے خلاف ان کی علم دوستی اور روح کی تازگی کی وجہ سے تھے مگر باقی دنیا کے عام لوگ جن میں تاجرین، ملازمین حتیٰ کہ ایک قحبہ خانے کی نائکہ بھی ان کے خلاف ہوئی کیونکہ شمس تبریز نے ان کی ایک طوائف کو انسانیت کا ایسا سبق پڑھایا کہ اس کی روح جاگ اٹھی اور قحبہ خانہ چھوڑ کر چلی گئی۔

> ''تم مجھے کیوں الزام دے رہے ہو؟'' وہ بولی، ''الزام اُس درویش کو دو۔ اُسی نے گلِ صحرا کو ورغلا کر قحبہ خانہ چھوڑنے اور خدا کی جستجو پر قائل کیا تھا''۔ لمحے بھر کو مجھے سمجھ نہ آئی کہ وہ کس کی بات کر رہی تھی، لیکن پھر مجھ پر عیاں ہوا کہ اس کی مراد شمس تبریز کے سوا کسی سے نہیں تھی۔''۴۱

شمس تبریز انسانیت کو جگانے اور انسانیت سے عشق کرنے کا جذبہ لے کر ہی زندگی کے سفر پر نکلے تھے۔ عشق وہ مضبوط جذبہ ہے جس کے لیے انسان اپنی عزیز ترین متاع جان کو بھی قربان کر دیتا ہے۔ عشق کے حصول کے لیے انسان دن رات ایک کر دیتا ہے اور کھانے پینے کی پرواہ ترک کر دیتا ہے۔ عشق بذات خود چیز نہیں بلکہ جس سے گہری انسیت پیدا ہو جائے وہی آپ کا عشق بن جاتا ہے۔ یہ عشق ہی ہے کہ اس کے پا لینے کے بعد انسان کے دل سے باقی دنیا کی محبت کا خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن اس 'باقی دنیا' سے مراد باقی تمام انسان نہیں بلکہ تمام قسم کے وسائل اور خصائص ہیں جو مادی دنیا کے لیے کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ شمس تبریز نے دعا مانگی تھی کہ ان کو ایک

سچا رفیق ملے جس تک وہ اپنا تمام علم منتقل کر دیں اور وہ ان کی موت کے بعد ان کے علم کو دوسروں تک پہنچائے۔اس دعا کے بدلے شمس تبریز کو مولانا روم کی رفاقت میسر ہوئی اور مولانا روم بھی ان کے سچے عاشق نکلے اس طرح دونوں کے درمیان عشق و محبت کی ایک ایسی پاکیزہ داستان پروان چڑھی کہ دونوں ہی باقی دنیا کی کے فوائد و نقصانات بھول گئے۔ شمس تبریز نے جس دن مولانا روم کو سماع کی محفل میں رقص کرنے کو کہا تو مولانا روم کے سب گھر والے شمس تبریز کے خلاف ہو گئے حتیٰ کے مولانا روم کی بیوی کیرا نے شمس تبریز کو سمجھانے کی بھی کوشش کی مگر شمس تبریز نے سماع کی محفل کا اہتمام کیا اور اس سے اور بھی بہت سے لوگ شمس تبریز کے خلاف ہو گئے۔اس حوالے سے کیرا کہتی ہیں:

> ''میں نے اس امید میں شمس تبریز سے کہا کہ شاید یہ سن کر وہ اپنی اگلی بات کہنے سے رک جائیں۔ ''کم از کم اس رقص کو ذرا ملتوی ہی کر دیں۔''''ہر کوئی تو خدا کو بھی اچھا نہیں سمجھتا۔''شمس تبریز نے اُسی سانس میں جواب دیا،''کیا ہم اُس پر یقین کو بھی ملتوی کر دیں؟''۴۲

شمس تبریز کا ہر کام خدا کی خوشی کے لیے ہوتا مگر دیکھنے والے اس کو دنیا کی آنکھ سے دیکھتے اور اس طرح ہر دن شمس تبریز کے مخالفین بڑھتے چلے گئے۔ مگر شمس تبریز نے کبھی بھی اس بات پر کسی کی پرواہ نہیں کی بلکہ ان کے نزدیک صرف اور صرف انسانیت کے دل میں خدا کا گھر بنانا اور اپنے دل میں انسانیت کے لیے محبت اور محبت سے بڑھ عشق زندہ رکھنا تھا۔

مولانا روم کے بیٹے علاؤالدین مولانا روم کے محفلِ سماع میں رقص کرنے اور پھر شمس تبریز کے سلطان کی توہین کرنے پر اس قدر برہم تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ شمس تبریز کسی طرح یہاں سے چلے جائیں۔علاؤالدین کو اپنے والد کی نیک نامی جانے پر انتہائی رنج ہوتا تھا مگر مولانا روم کسی صورت بھی شمس تبریز کو خود سے دور بھیجنے یا ان کی کسی بات پر انکار کرنے کے متحمل نہیں تھے۔یہ باتیں علاؤالدین کو ایک آنکھ بھی نہ بھاتی تھیں اور ایک دن موقعہ پا کر انہوں نے شمس تبریز کو کہہ دیا:

> ''تم یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے، ہمیں سکون سے کیوں نہیں رہنے دیتے؟ تمہاری آمد سے پہلے ہم اچھے تھے۔''میں نے جواب دیا،''میرے والد ایک قابلِ

احترام عالم اور کنبے والے شخص ہیں۔ تم دونوں کے درمیان کچھ بھی ایک سا نہیں۔"۴۳

شمس تبریز نے ان سب لوگوں کی نفرت اور غصے کا کھلے دل سے سامنا کیا اور کسی کو ایک لفظ تک بھی نہ کہا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اپنا کام کر رہا ہے اور باقی سب لوگ اپنا کام کر رہے ہیں۔ شمس تبریز جب مولانا روم کو حقیقت کے راز پڑھا چکے تو وہ جان گئے تھے اب ہم زیادہ دیر ایک ساتھ نہیں رہ سکیں گے کیونکہ اس رفاقت کا مقصد اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ایک دن شمس تبریز مولانا روم کو کہتے ہیں:

"مجھے بابا زمان کی ایک بار بتائی گئی بات یاد آئی۔ ریشم کی نشو و نما کے لیے، ریشم کے کیڑے کی موت ضروری ہے۔ سب کے رخصت ہونے اور ہلچل ختم ہونے کے بعد وہیں دالان میں تنہا بیٹھے، میں جانتا تھا کہ مولانا رومی اور میرا ساتھ ختم ہونے کو تھا۔"۴۴

شمس تبریز جان گئے تھے کہ میں اپنا کام پورا کر چکا ہوں پس مجھے یہاں سے جانا ہو گا۔ شمس تبریز ایک بار جب قونیہ کو چھوڑ کر چلے گئے تو مولانا روم اس جدائی کو برداشت نہ کر سکے اور اپنے بیٹے سلطان ولد کے ذریعے شمس تبریز کو واپس بلوایا مگر یہ واپسی بھی زیادہ دیر مولانا روم کو خوشی دینے والی نہیں تھی اور ویسے بھی شمس تبریز کا واپس آنا ان کے دشمنوں کو بالکل پسند نہ آیا اور اس بار انھوں نے شمس تبریز کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ شمس تبریز کا تقدیر پر پورا یقین تھا اور وہ بھی اپنی موت کی حقیت سے کسی طور بھی منکر نہ تھے۔ جس رات ان کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا وہ اس رات محبت کا سینتیسواں اصول بیان کر رہے ہوتے ہیں:

"یہ اصول نمبر سینتیس ہے۔ "شمس تبریز نے بات جاری رکھی، "خدا ایک باریک بین گھڑی ساز ہے اس قدر درست ہے اُس کا حکم زمین پر ہر امر اپنے وقت پر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ نہ لمحہ بھر پہلے نہ ہی لمحہ بھر تاخیر سے۔ اور ہر کسی کے لیے گھڑی بالکل درستی سے کام کرتی ہے۔ ہر کسی کے لیے محبت کا ایک مخصوص وقت ہے اور موت کا ایک وقت مقرر۔"۴۵

شمس تبریز کے قاتلوں نے ان پر رات کے پہر حملہ کر کے ان کو ابدی نیند سلا دیا مگر ان کی موت بھی محبت کا ایک انوکھا اصول بن گئی کہ جب قاتل نے ان کو قتل کر کے کنویں میں پھینکا تو قاتل خود بھی حیران ہو گیا

کہ ان کی لاش کے پانی میں گھرنے کی ذرا سی بھی آواز نہ آئی، جیسے ان کی لاش کسی کھونٹی پر لٹک گئی ہو اور کنویں کے پیندے تک نہ پہنچی بلکہ ان کے محبوب نے ان کی لاش کو بھی ہواؤں پر سوار کرواکر اپنے پاس بلالیا تھا۔

''ہم نے مل کر اس کی لاش اٹھائی جو عجیب طور پر بے حد ہلکی پھلکی تھی اور اُسے کنویں میں گرادیا۔ ہانپتے ہوئے ہم میں سے ہر ایک نے ایک قدم پیچھے ہٹایا اور لاش کے پانی میں گرنے کے چھپاکے کے انتظار کرنے لگے۔ وہ آواز کبھی نہ آئی۔''۴۶

شمس تبریز کے قتل کے حوالے سے نفحا تالانس میں لکھا ہے:

''مولانا کے صاحبزادے علاؤالدن محمد نے یہ حرکت کی نفحا تالانس میں میں شمس کی شہادت کا سن ۶۴۵ھ لکھا ہے۔ غرض شمس کی شہادت یا غیبوت ۶۴۴ھ اور ۶۴۵ھ کے بیچ بیچ میں ہے۔''۴۷

شمس تبریز کا قتل صرف شمس تبریز کے جسم کو قتل کر گیا مگر روح کو ہمیشہ کے لیے کئی اور شمس تبریز نامی صوفیا میں جاگزیں کر گیا۔ شمس تبریز جس امانت کو دوسروں تک پہنچانا چاہتے تھے وہ اس امانت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔

حوالہ جات

۱۔ Billy Gray,Rumi,Sufi spirituality and teacher disciple relationship in Eli Shafak,s The Forty Rules of love,p125,https//doi.org/10.30674/scripta.84280

۲۔ فرخ سہیل گوئندی،(مقدمہ)چالیس چراغ عشق کے،جمہوری پبلیکشنز،لاہور،۲۰۱۷

۳۔ Tolba Mohamed Amine,The impact of Sufism on the contemporary American Society in ElafShafak,s novel, The Forty rules of love,Larabi Bin M,hidiUniversity,Oum El bouagh,2016,p54.55

۴۔ Billy Gray,Rumi,Sufi spirituality and teacher disciple relationship in Eli Shafak,s The Forty Rules of love,p127,https//doi.org/10.30674/scripta.84280

۵۔ Dr.AfreenFaiyaz,Thou Shalt Love!:The Contemporary Relevance of Rumi in ElifShafak,SThe Forty Rules of love A character based...QasimUniversity,Saudi Arabia,2019,p22۵۔

۶۔ سید عابد حسین،اسلام اور عصر جدید(خصوصی شمارہ نذر رومی)،ذاکر حسین انسٹیانسٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز،جامعہ ملیہ نئی دہلی،۲۰۰۷،ص۶

۷۔ محمد اکرام چغتائی،مولانا جلالالدین رومیؒ حیات وافکار،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۴ء ص ۱۲

۸۔ ایلفشفق،چالیس چراغ عشق کے،جمہوری پبلیکشنز،لاہور،۲۰۱۷ء ص۱۰۹

۹۔ ایضاً ص ۱۱۰

۱۰۔ ایضاً ص۱۰۹

۱۱۔ ایضاً ص ۱۷۱

۱۲۔ ایضاً ص ۱۷۲

۱۳۔ ایضاً ص ۱۷۲

۱۴۔ محمد اکرام چغتائی،مولانا جلالالدین رومیؒ حیات وافکار،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۴ء ص ۱۵

۱۵۔ ایلف شفق،چالیس چراغ عشق کے،جمہوری پبلیکشنز،لاہور،۲۰۱۷ء ص ۱۷۸

۱۶۔ ایضاً ص ۱۸۱

۱۷۔ ایضاً ص ۱۸۵

۱۸۔ ایضاً ص ۱۹۵

۱۹۔ ایضاً ص ۱۹۹

۲۰۔ ایضاً ص ۲۰۹

۲۱۔ ایضاً ص ۲۹۷

۲۲۔ ایضاً ص ۵۳

۲۳۔ ایضاً ص ۱۱۱

۲۴۔ ایضاً ص ۳۶۶۔۳۶۷

۲۵۔ ایضاً ص ۴۹

۲۶۔ Tolba Mohamed Amine,The impact of Sufism on the contemporary American Society in ElafShafak,s novel, The Forty rules of love,Larabi Bin M,hidiUniversity,Oum El bouagh,2016,p56

۲۷۔۸۔ ایلفشفق، چالیس چراغ عشق کے، جمہوری پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء ص ۲۹۹

۲۸۔ مفتی غلام معین الدین نعیمی (مترجم)، کشف المحجوب، بابا پبلشرز اردو بازار، لاہور، س ن ص ۴۹۹۔۵۰۰

۲۹۔ Tolba Mohamed Amine,The impact of Sufism on the contemporary American Society in ElafShafak,s novel, The Forty rules of love,Larabi Bin M,hidiUniversity,Oum El bouagh,2016,p54.55

۳۰۔ ایلفشفق، چالیس چراغ عشق کے، جمہوری پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء ص ۳۶۵

۳۱۔ ایضاً ص ۳۶۹

۳۲۔ ایضاً ص ۳۷۱

۳۳۔ ایضاً ص ۴۲

۳۴۔ ایضاً ص ۵۵

۳۵۔ ایضاً ص ۱۲۳

۳۶۔ ایضاً ص ۱۳۸

۳۷۔ ایضاً ص ۳۱۷

۳۸۔ ایضاً ص ۲۹۹

۳۹۔ ایضاً ص ۳۱۹

۴۰۔ ایضاً ۲۷۹

۴۱۔ ایضاً ص ۲۸۲

۴۲۔ ایضاً ص ۲۸۷

۴۳۔ ایضاً ص ۲۹۴

۴۴۔ ایضاً ص ۲۹۸

۴۵۔ ایضاً ص ۳۵۵

۴۶۔ ایضاً ص ۳۵۶

۴۷۔ محمد اکرام چغتائی، مولانا جلال الدین رومیؒ حیات و افکار، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء ص ۱۸

باب سوم: جمیلہ ہاشمی کے ناول "دشتِ سوس" کا جائزہ (تصوف کے تناظر میں)

جمیلہ ہاشمی:

جمیلہ ہاشمی اردو ادب کی مشہور ناول نویس اور افسانہ نگار ہیں۔ اردو ناول اور افسانے میں ان کی گراں قدر خدمات ہیں۔ جمیلہ ہاشمی کے اس قدر معروف ہونے کے باوجود بھی ان کی تاریخ پیدائش کے سال کے بارے میں دو رائے موجود ہیں۔ جمیلہ ہاشمی نے اپنی تاریخ پیدائش کے حوالے سے حمیرا اطہر کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ:

> "میری پیدائش ۷ انومبر ۱۹۲۹ء گوجرہ کی ہے۔ ہم امرتسر کے رہنے والے ہیں۔ سکھوں اور ہندوؤں کے ساتھ ہمارے گھریلو مراسم تھے"۔[۱]

جمیلہ ہاشمی کے والد ایک تاجر تھے اور کپڑے کا کاروبار کرتے تھے اور وہ کپڑا لانے کے لیے امرتسر سے کوئٹہ آتے تھے۔ کپڑے کے ساتھ ساتھ وہ کچھ دھاگہ بھی لے جاتے اور امرتسر میں جو کھڈیاں لگا رکھی تھیں ان میں کپڑا بنتے۔ جمیلہ ہاشمی کے والد کا کاروبار تقسیمِ ہندوستان کے وقت عروج پر تھا مگر تقسیم ہند کے ساتھ ہی ان کا کاروبار تباہ و برباد ہو گیا۔

جمیلہ کی والدہ فضل النساء امرتسر کے سکول میں ہیڈ مسٹریس تھیں۔ جمیلہ کی والدہ کے عہدے کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ان کے ننھیال میں لڑکیوں کو تعلیم دینے کا رواج عام تھا۔ جمیلہ ہاشمی کی پیدائش کے وقت ان کی والدہ اپنے میکے گوجرہ چلی گئیں۔ جمیلہ ہاشمی کی ایک اور بھی بہن تھی۔ جمیلہ ہاشمی کے متعلق محمد اسلم لکھتے ہیں:

> "والدہ فضل النساء گورنمنٹ ہائی سکول امرتسر میں ہیڈ مسٹریس تھیں؛ پہلے بچے کی پیدائش کے لیے میکے گھر میں (گوجرہ) گئی ہوئی تھیں؛ بچی پیدا ہوئی تو اس کا نام جمیلہ رکھا گیا۔ یہ وہی جمیلہ ہیں جو بعد ازاں جمیلہ ہاشمی کے نام سے معروف ہئیں۔ جمیلہ کی والدہ گوجرہ کی تھیں، ان کی ایک اور بہن تھی، جمیلہ کے نانا، نانی اور خالہ نے قادیانی مذہب اختیار کر لیا تھا لیکن فضل النساء اپنے اصل مذہب پر قائم رہیں۔ وہ صوم و صلوۃ کی پابند اور راسخ العقیدہ مسلمان تھیں"۔[۲]

جمیلہ نے امرتسر کے سکول سے میٹرک کیا، امرتسر کے کالج سٹینڈ فورڈ سے ایف اے کا امتحان پاس کیا اور پھر اسی کالج سے ڈبل میتھ کے ساتھ بی اے کا امتحان پاس کیا۔ بی اے کے تعلیمی دور میں جمیلہ ہاشمی شاعری بھی

کرتی تھیں مگر بعد میں وہ نثر کی طرف آئیں۔ جمیلہ ہاشمی کو انگریزی ادب سے خاصی دلچسپی تھی اور پھر انھوں نے ایف سی کالج سے ۱۹۵۳ء میں انگریزی ادب میں ایم کیا۔ محمد اسلم لکھتے ہیں:

"بی اے میں ڈبل میتھ پڑھتی رہیں؛ اس وقت شاعری بھی کرتی تھیں۔
۱۹۵۳ء کو ایف سی کالج سے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا۔" ۳

۱۸ اگست ۱۹۵۹ء کو جمیلہ ہاشمی کی شادی صوبہ سندھ کے شہر سمہسٹہ کے ایک امیر کبیر جاگیر دار اور اس وقت کے صوبائی اسمبلی کے رکن سردار اویس احمد اویسی سے ہوئی۔ شادی کے ایک سال بعد ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جو اگلے ہی دن داغ مفارقت دے گیا اور ۱۹۶۶ء کو ان کے ہاں عائشہ صدیقہ پیدا ہوئیں جو ان کی اکلوتی اولاد ہیں۔

جمیلہ ہاشمی نے اپنے ادبی شوق کی پرورش کے لیے لاہور کو مسکن بنایا اور ۱۹۵۷ء میں ان کا پہلا افسانہ ادبی جریدے لیل ونہار میں چھپا۔ ذولقرنین عسکری ان کی پہلی تحریر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میرا پہلا افسانہ لیل ونہار میں ۱۹۵۷ء میں چھپا تھا۔ بقول سائرہ ہاشمی ان کا
پہلا افسانہ ''لال آندھی تھا۔" ۴

جمیلہ ہاشمی کے ادبی سفر میں کافی وسعت اور رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے تاریخ، تہذیب، مسلم معاشرت، سکھ معاشرت اور تانیثیت جیسے موضوعات کو اپنے ادبی کارناموں میں جگہ دی۔ جمیلہ ہاشمی نے اپنے ادبی دور کے آغاز میں ہی عورت کے لیے آواز اٹھائی اور جہاں عورت کے مقام کو اجاگر کرنے کی بات آئی تو انھوں نے ۱۹۶۱ء ''تلاشِ بہاراں'' جیسا آدم جی ایوارڈ یافتہ ناول لکھ کر شہرت دوام حاصل کی۔۔ ۱۹۶۴ء میں ''آتشِ رفتہ'' نامی ناولٹ لکھی، جس میں سکھ معاشرت کی بڑی خوبصورتی سے عکاسی کی ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے اپنا بچپن گوجرہ میں رہتے ہوئے سکھ معاشرے میں گزارہ تھا اس لیے وہ سکھ معاشرے سے بخوبی واقف تھیں اور اس واقفیت کو انھوں نے اپنی ناولٹ میں پیش کیا۔ اس ناولٹ سے جمیلہ ہاشمی کی زمین سے محبت بھی سامنے آتی ہے۔

جمیلہ ہاشمی نے تصوف اور تاریخی ناول نگاری کے سفر کا آغاز ۱۹۷۰ میں ''چہرہ بہ چہرہ روبہ رو'' سے کیا۔ یہ ناول ایران کی متنازعہ شخصیت قرۃ العین طاہرہ کے گرد گھومتا ہے۔ تاریخ کے گمشدہ اوراق کو ادبی صفحات پر جگہ دے کر ایک نئی دلچسپ صورت دے دی۔ تاریخی اور مذہبی معاملات کو ادبی تحریر میں جگہ دینا آسان نہیں ہوتا مگر جمیلہ ہاشمی نے یہ کارنامہ اس قدر احسن طریقے سے سرانجام دیا کہ متنازعہ اور بوریت شدہ چیز کو مقبولیت کی چیز

بنا دیا۔ جمیلہ ہاشمی کا تاریخ سے ایسا لگاؤ پیدا ہوا کہ اس کے بعد حسین بن منصور جیسے صوفی پر ناول لکھا۔ ۱۹۸۳ء میں ''دشتِ سوس'' جیسا ناول لکھ کر حسین منصور جیسی شخصیت کو اپنے کارنامے کا حصہ بنایا۔ حسین تصوف کی دنیا میں ایک بدنام صوفی کے طور پر جانے جاتے تھے اور ان پر قلم اٹھانا اور ان کو اپنی تحریر میں تاریخ بنا کر پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جمیلہ ہاشمی نے تاریخی اور مذہبی حوالے سے متنازعہ شخصیات کو ادب میں بڑے دلچسپ طریقے سے محفوظ کر دیا۔ ''روہی'' نامی ناولٹ لکھی اور اس میں خیبر پختونخوا کے پسِ منظر میں ایک عشقیہ کہانی بیان کی۔

جمیلہ ہاشمی ادبی تحریروں کے ساتھ ساتھ کئی ادبی حلقوں کی رکن بھی رہیں، جن میں حلقہ ارباب ذوق، مری لٹریری سرکل اور سہ ماہی جریدے وغیرہ شامل ہیں۔ جمیلہ ہاشمی کسی بھی محفل میں جاتیں تو محفل کو چار چاند لگا دیتیں۔ جمیلہ ہاشمی کی شخصیت ایسی تھی وہ جس مجلس میں شرکت کرتیں تو پوری مجلس کا دھیان ان کی طرف ہو جاتا۔ جمیلہ ہاشمی کی شخصیت کے حوالے سے محمد خالد کہتے ہیں:

> "وہ ان کمیاب لوگوں میں تھیں جو کمرے میں داخل ہوتے تو گویا ایک اور شمع جل جاتی ہے۔ اپنی ذات میں ایک انجمن، ڈلنیس، اکتاہٹ اور بیزاریاں ان کے آتے ہی اپنی راہ پکڑ لیتی تھی۔ ان کی گفتگو میں ایک ایسی رونق اور ہنگامہ خیزی کی کیفیت ہوتی تھی جو میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی ہے۔"۵

جمیلہ ہاشمی شگفتہ ادبی تحریریں لکھنا پسند کرتی تھیں اور ان کی تحریریں رنگین ہوتی تھیں مطلب ان کی تحریروں میں بہترین لفاظی، خوبصورت جملے، تشبیہات اور استعارات کا استعمال باخوبی ملتا ہے۔ انھوں نے انگریزی کی سند کو ہمیشہ نازگی نگاہ سے دیکھا کیونکہ اس کے ذریعے انھوں نے بہت سا انگریزی ادب پڑھ رکھا تھا اور اس سے بھی ان کی تحریروں میں نکھار آیا تھا۔ انگریزی کی سند کے حوالے سے حمیرا اطہر کو اپنے انٹرویو میں بتاتی ہیں:

> "جو انگریزی کا ایم اے نہیں ہے وہ اچھا رائٹر نہیں ہو سکتا۔ یہاں بات محض ڈگری حاصل کرنے کی نہیں۔ بلکہ انگریزی ادب کا مطالعہ کرنے کی ہے۔ انگریزی پڑھ کر لکھنے کا شعور آتا ہے۔ کیونکہ بھرپور اور جان دار ادب انگریزی میں ملتا ہے۔"۵۔۶

جمیلہ ہاشمی نے بنگال، انگلینڈ، سپین، عرب اور دیگر کئی ملکوں کے سفر بھی کر رکھے تھے۔ جمیلہ ہاشمی آخری عمر میں اندلس پر تاریخی ناول لکھنا چاہتی تھی مگر خرابیٔ صحت کی وجہ سے اس کام کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکیں۔ شوگر کے مرض میں مبتلا تھیں اور اسی مرض نے ان کو ۱۰ جنوری ۱۹۸۸ء کو خالقِ حقیقی سے جاملایا۔

الف: حسین بن منصور کی ابتدائی تعلیم

حسین بن منصور حلاج جس کے دادا آتشی مذہب کے پجاری تھے اور اس کے والد نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ منصور نے یونانی فلسفے کی تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ منصور کے والد محمی مجوسیت کی تعلیم میں اپنی مثال آپ تھے اور وہ زرتشتی مذہب کے بارے میں اس قدر جانتے تھے کہ اپنے ہر مخالف کو شکست دے دیتے تھے مگر منصور اکثر اپنے والد کو مذہبی معاملے میں زیر کر لیتا تھا۔ منصور نے اپنے آپ کو علم الکلام اور فتنوں سے دور رکھنے کے لیے خود کو محمی کے ساتھ سرائے میں نہیں لگایا تھا بلکہ دشتِ سوس کے کنارے ذرا دور شہتوت کے درختوں کے جنگل کے پاس جا بسایا تھا۔ دشت سوس کے کنارے آکر منصور ایک تو فتنوں سے بچ گیا اور دوسرا باپ کے پیشہ روز گار سے مختلف پیشہ ریشم کے کیڑے پالنے کی تجارت کرنے لگا۔

> "ان فتنوں سے دور رہنے کے لیے منصور نے اپنے آپ کو محمی کے ساتھ سرائے میں نہیں لگایا تھا اور یہ کاروبار اس کے مزاج کے مطابق بھی نہیں تھا۔ وہ دشت سوس کے کنارے کنارے ذرا اوپر کی طرف ایک ایسے قصبے میں سکونت پذیر تھا جہاں شہتوت کے درختوں کے جنگل کے جنگل تھے اور ریشم کے کیڑے پالنے اور پھر ریشمی کپڑا بننے کا کام ہوتا تھا۔"۷

۲۴۴ھ میں دشتِ سوس کے کنارے منصور کے ہاں ایک بچے کی پیدائش ہوئی اس کا نام حسین رکھا گیا جو بعد میں حسین بن منصور حلاج کے نام کو پہنچا۔ منصور نے اپنے بیٹے کا نام حسین رکھا اور یہ باتیں جانتے ہوئے بھی کہ اس نام پر زیادہ مشکلیں آتی ہیں جیسے حضرت حسینؓ کو اسلام کے دشمنوں نے شہید کر دیا تھا۔ منصور نے اس نام کی ذمہ داریوں کو جانتے ہوئے بھی اپنے بیٹے کا نام حسین ہی رکھا۔

> "پدر محترم مجھے اس نام کا اختصار اس کی عظمت اور اس کا مکمل ہونا پسند ہے۔ آپ دیکھیئے نا لکھنے میں کتنا مختصر اور جہانِ معانی رکھنے میں لاجواب

اور پھر اس کی نسبتیں کتنی عظیم ہیں۔ کوئی زرتشتی نام اس کو نہیں پہنچتا۔"۸

حسین بن منصور حلاج بچپن سے ہی باقی بچوں سے کچھ زیادہ ضدی اور چیزوں کو غور سے دیکھتا ہوا نظر آتا تھا۔ حسین کی ان عادتوں کی وجہ سے منصور اس سے عاجز آجاتا اور جب بھی حسین کا دادا محمی حسین سے ملنے آتا تو منصور کہتا، پدر محترم آپ اسے ساتھ لے جائیں اور سختی سے اس کی تربیت کریں مگر محمی حسین سے بہت محبت کرتا تھا اس لیے وہ منصور کی سختی دیکھ کر کہتا کہ بچپن میں سارے بچے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ آپ بھی بچپن میں ایسے ہی تھے اور ہم نے بھی آپ کی ایسے ہی تربیت کی تھی اس لیے عاجز آنے کی بجائے اس سے محبت کا دروا رکھیں۔ تو منصور اس کے جواب میں اپنے والدِ محترم کو کہتا:

"نہیں پدرِ محترم! آپ اسے نہیں سمجھ سکتے۔ آپ اسے اپنے ساتھ لے جائیں تو آپ کو پتہ چل جائے گا۔ اسے پالنا اور اس کی تربیت کرنا روز بروز مشکل ہوتا جاتا ہے۔"۹

حسین بن منصور حلاج کے پدرِ محترم دنیا کے سفر سے زیادہ علمی مجلسوں میں جانا پسند کرتے تھے اور اپنے بیٹے کو بھی ابتدائی عمر میں ہی دینی مجلسوں میں بھیجنا چاہتے تھے۔ اس خواہش اور تربیت نے حسین پر خوب اثر دکھایا اور حسین نے کئی سالوں تک دینی مجلسوں اور مدرسوں کا طواف کیا مگر ان کی طبیعت اس سے بھی کچھ زیادہ چاہتی تھی۔ جب حسین کی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا تو منصور حسین کو جندیساپور کے ایک عیسائی مدرسے میں بھیجنا چاہتا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا دنیا کا سفر کرے اور دنیا کے بارے میں جانے۔ اس خواہش کے جواب میں محمی نے منصور کو کہا کہ تم خود سفر کے خلاف ہو اور اس سے بھی بڑھ کر عیسائیت کے خلاف ہو مگر پھر بھی اپنے بیٹے سے وہی کام کیوں کروانا چاہتے ہو۔ منصور چاہتا تھا کہ میرا بیٹا اگر غلط سے درست خود تلاش کرے گا تو اس کو اس بات کی زیادہ قدر ہو گی۔

"جی پدر محترم! اور یہی بات میں چاہتا ہوں حسین میں پیدا ہو۔ اس کو وہ تعلیمات اندر سے مضطرب رکھیں گی تو وہ سچ کی تلاش میں سرگرداں رہے گا۔ وہ غلط سے صحیح کی طرف اپنا سفر جاری رکھ سکے گا۔ اسے اقصائے عالم میں تجارتی قافلوں اور دولت کی نہیں، اصل حقیقت کو پانے کی خاطر گھومتے رہنا ہو گا۔"۱۰

محمی اپنے بیٹے منصور کی باتوں سے بہت حیران ہوا۔ منصور ہمیشہ دلائل و براہین کی باتیں کیا کرتا تھا اس لیے اس کے پدرِ محترم کو اس کی باتوں کو ماننا پڑتا۔ منصور جانتا تھا کہ لوگ مال تجارت کے لیے دور دراز کے سفر کرتے ہیں اور اس کے بدلے ذرا سی مالی منفعت حاصل ہوتی اور حسین عشق صادق کی طلب کے لیے دنیا کیوں نہیں گھوم سکتا۔ منصور اپنے بیٹے کو جندیساپور کے عیسائی مدرسے کی تعلیم کے بعد تستر لے گیا اور منصور کو اپنے بیٹے سے یہ امید تھی کہ وہ اپنے خون میں شامل زرتشتی خون سے ایمان فروزاں کر سکے مگر تستر پہنچ کر بھی حسین کا دل نہ لگا اور ہم سبقوں سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تھا۔ حسین صرف ہم جماعتوں سے ہی جھگڑا نہیں کرتا تھا بلکہ اپنے استادوں کی بھی غلطیاں نکالتا تھا۔ تستر کے مدرسے میں حسین نے اپنے استاد کی فاقہ کشی اور راتوں کا جاگنا دیکھا تو اسے بھی حیرت کی نظر سے نہ دیکھا بلکہ اسے نفس کی تربیت کا حصہ سمجھتا اور اپنے استاد کی غیر موجودگی میں استاد کی لائبریری میں جا پہنچتا اور استاد کے رسائل کا مطالعہ کرتا جو اسے سمجھ تو نہ آتے مگر کچھ عجیب ضرور لگتے۔ ان سب باتوں کا احوال اپنے باپ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> "ان کی عدم موجودگی میں مجھے اپنا درس خوب یاد ہو جاتا ہے تو میں کچھ کام کرنے کی جگہ انہیں دیکھتا ہوں۔ عجیب باتیں ان میں لکھی ہیں جو ابھی تو سمجھ و ادراک سے بالا ہیں مگر شاید سمجھ آنے لگیں۔ دعا کیجیے میں استادِ محترم کی خدمت کر سکوں اور مدرسے کے لیے باعثِ فخر بنوں۔"۱۱

حسین بن منصور کے والد جب تستر میں حسین سے ملنے گئے تو اس نے کہا بابا آپ شیخ سے مل لیجیے مگر جو میں نے آپ کو خط میں لکھا تھا وہ ان سے نہ بولنا۔ کیونکہ حسین جو رسائل پڑھ رہا تھا وہ اس کے استاد کی مرضی کے خلاف تھا مگر وہ بہت سا کام بہت جلدی کر گزرنا چاہتا تھا۔ جب منصور نے پوچھا آپ ایسا کام کیوں کرتے ہیں جس پر استفسار کیا جائے استاد کی ناراضی مول لی جائے تو اس پر حسین نے کہا:

> "میں قدم قدم نہیں چل سکتا اس میں ایک عمر صرف ہو جاتی ہے۔ میرے پاس اتنا وقت کہاں ہے؟ اگر آپ میری بات پر ہمدردی سے غور کریں گے تو سب بات آپ پر واضح ہو جائے گی۔"۱۲

حسین بن منصور حلاج جس رفتار سے چلنا چاہتا تھا وہ واقعی سہل تستری کے طے شدہ پیمانوں سے بہت زیادہ تھی اس لیے ان کو اپنی راہ خود تلاش کرنے کے لیے سرگرداں ہونا پڑا۔

ب۔ حسین بن منصور حلاج کی زندگی میں پہلا انقلاب:

شیخ سہل عبداللہ تستری اور منصور کی آمنے سامنے بیٹھ کر جب ملاقات چل رہی تھی تو شیخ سہل عبداللہ تستری نے کہا کہ تمہارا بیٹا دعا اور مقدر کے بارے میں کچھ زیادہ ہی جان گیا ہے اس لیے اس کا یہاں مزید رہنا ممکن نہیں اور آپ بھی اپنے کام کی وجہ سے مزید یہاں نہیں رک سکیں گے۔ شیخ نے کہا تمہارے بیٹے کے لیے کسی اور جگہ کے احکام ہیں۔اس طرح حسین بن منصور حلاج تستر سے وقت سے پہلے اوراپنی عمر اور جماعتوں کی سطح سے زیادہ سیکھ گیا تھا اور اب یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔

حسین بن منصور نے اب تستر کی خانقاہ کو ایک قید سمجھنا شروع کر دیا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ دنیا کی سیر کر کے بہت سے راز جاننا چاہتا ہے مگر یہاں تو شیخ اسے اپنی مرضی سے ذرا بھی خلاف کوئی کام نہیں کرنے دیتے تھے ۔اس لیے اس نے نہایت عاجزی سے اپنے پدرِ محترم سے کہا:

"تستر ساری دنیا نہیں ہے اور آپ میرے پیچھے کب تک سرگرداں ہوں گے؟"۱۳

ان لفظوں میں حسین بن منصور نے اپنے پدرِ محترم کو ایک اشارہ دے دیا تھا کہ اب وہ اس محدود سی جگہ میں قید کی زندگی نہیں گزار سکے گا بلکہ یہاں سے نکل کر دنیا کی سیر کرے گا اور حقیقت کی تلاش کرے گا۔ منصور بھی اپنے بیٹے کی باتیں سن کر حیران ہو گیا اور وہ باپ ہونے کے ناطے اس بات کو سمجھ گیا کہ اس کے بیٹے کو یہاں چین نہیں اور کسی بڑی حقیقت اور راز کا متلاشی نظر آتا ہے۔ یہی وہ پہلا موقعہ تھا جب حسین نے اپنے دل کی بہت سی باتیں اپنے باپ کے سامنے کہہ ڈالیں۔

"اقصائے عالم میں ہواؤں کی طرح آزاد گھومنے کو میرا جی چاہتا ہے۔ ہواؤں پر حکمرانی کرنے کو بادلوں پر سوار ہونے کو۔ میں آپ کو کیا بتاؤں میں کیا کچھ کرنا چاہتا ہوں، کبھی سوچتا ہوں میرے بازو پھیلیں تو مشرق اور مغرب کو چھو لیں۔ برفانی چوٹیاں میرے قدموں تلے ہوں۔ کوہسار میرے زیر نگیں ہوں۔ عرش کی نیلاہٹ اور ستاروں کی

جگمگاہٹ کو چھو کر دیکھوں۔ دنیا میرے قدموں تلے سمٹ جائے۔ فاصلے ایک نکتے کی
طرح ہوں۔"۱۴

یہ سب وہ باتیں تھیں جو ایک عام انسان نہیں کر سکتا تھا مگر یہاں ایک چھوٹا سا بچہ ایسی باتیں کر رہا تھا۔ منصور پہلے سے بھی زیادہ حیران تھا کہ اس کا بیٹا ایک دیوانے کی سی باتیں کیوں کرنے لگا۔ یہ وہ پہلا انقلاب تھا جس نے حسین کو حقیقت کے رازوں کا متلاشی بنا کر عالمِ لا محدود کی سیر پر رواں کر دیا تھا۔

۱۔ حسین بن منصور اور سماجی اصلاح:

حسین بن منصور کے شوق اور مزاج میں تبدیلیاں دیکھ کر منصور چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا بیضا واپس آئے اور وہاں پر آکر ایک درس گاہ قائم کرے اور لوگوں کو دینی باتیں بتائے۔ منصور جانتا تھا کہ اس پُر آشوب دور میں جہاں فرقہ واریت نے زور پکڑا ہوا تو وہاں پر مسلم مذہب کو پھیلانے کی بھی ضرورت ہے۔

"جانِ پدر تم کچھ اور نہ سوچو، سوائے اس کے تمہیں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے
بعد بیضا میں مدرسہ قائم کرنا ہے۔ ان علاقوں میں بہت ضرورت ہے۔"۱۵

حسین بن منصور ان سب ذمہ داریوں سے مبراء اور بہت حد تک دور نظر آتے تھے اور ہر وقت یوں دکھائی دیتے تھے جیسے ان کے سامنے ایک عظیم مقصد ہو اور وہ صرف اس مقصد کے لیے خود کو وقف کرنا چاہتا ہے بلکہ بہت حد تک اس مقصد میں کھو چکا ہے۔

۲۔ حسین بن منصور کے مقاصد:

حسین بن منصور نے دنیا کی سیر میں جہاں علاقے مخصوص نہیں کیے تھے وہاں ہندوستان کے رسم و رواج کے بارے میں سن کر اس کی سیر کے بارے میں بھی دل میں تہیہ کر لیا تھا۔ حسین بن منصور اس سے پہلے سہل عبد اللہ تستری کے رسائل کو جاننا چاہتا تھا اور شیخ کی ناراضی مول لیے بغیر یہ کام کرنا چاہتا تھا۔ حسین بن منصور یہ بھی جانتا تھا کہ شیخ اس کے اس کام سے سخت ناراض ہوں گے مگر اس ناراضی کو وہ ناراضی سمجھے بغیر اپنے مقصد تک پہنچنے میں لگا رہا۔ آخر ایک دن خطیب کے ذریعے سے شیخ نے حسین کو بلاوا بھیجا مگر حسین کو اس بلاوے پر ذرا بھی حیران اور پریشان نہ دیکھ کر خطیب نے کہا آپ کو ڈر نہیں لگتا اگر شیخ نے تمہیں کوئی سزا دے دی یا تمھارے لیے

کوئی بد دعا کر دی تو تم کیا کرو گے۔ حسین بھی جانتا تھا کہ شیخ صاحب ایک بزرگ ہستی ہیں وہ نظر کرم کریں گے تو بات بن جائے گی۔ سہل عبد اللہ تستری کی تعریف میں حضرت علی ہجویریؒ لکھتے ہیں:

"طریقت کے اماموں میں ایک بزرگ، مالکالقلوب، حضرت ابو محمد سہل بن عبد اللہ تُستریؒ ہیں جو شیخ وقت اور سب کے نزدیک ستودہ صفات تھے۔ آپصاحبِ ریاضت شدہ اور نیک خصلت تھے۔ اخلاص اور افعال کے عیوب میں آپ کا کلام لطیف ہے۔"١٦

حسین بن منصور نے جہاں، جہاں بینی اور کتب بینی کو اپنے مقاصد میں شامل کیا تھا وہاں اس نے شخصی آزادی کو بھی اپنا مقصد بنالیا تھا۔ حسین بن منصور کا اس سے اگلا مقصد شیخ کی خوشنودی حاصل کرنا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ وہ اس مقام تک کبھی نہیں پہنچ پائے گا کیونکہ اس نے شیخ کے رسائل تک رسائی حاصل کر کے گستاخی کی تھی۔ مگر شیخ کی ایک نظر ہی کافی تھی جو حسین کو اس کی مطلوبہ قوت بے پناسے واقفیت دلواسکتی تھی جس کی اس کو طلب تھی اور حسین بن منصور یہ مانتا تھا کہ اس کی قوت مدرکہ شیخ کی ایک نظر سے بے پناہ پردوں تک رسائی حاصل کرلے گی۔

"مگر جب تک فضلِ خداوندی اس کے حال پر مہربان نہ ہو اور شیخ کی نگاہیں اس کی اعانت نہ کریں وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کی عقل، اس کی قوتمدرکہ، اس کی قوتِ نمو، قوتِ فیصلہ سب شیخ کی ایک نگاہِ محبت کے تابع فرمان ہیں۔"١٧

حسین بن منصور بہت شوخ، گستاخ اور بے پرواسا ہو کر رہتا کہ کسی دن پھر شیخ اسے بلائے اور وہ اس سے عفو پائے مگر شیخ پہلے سے بھی زیادہ بے توجہی کا مظاہرہ کرتے۔ ان سب حالات کو دیکھ کر کبھی کبھی حسین سوچتا کہ وہ تستر سے نکل جائے کیونکہ تستر ہی تو پوری دنیا نہیں ہے مگر پھر وہ سوچتا کہ وہ کونسی زمین ہے جس پر جا کر وہ اپنے خوابوں کی تعبیر اور اپنے مزاج کی آزادی پائے۔

"اس کا جی چاہا کہ وہ یہاں سے فرار ہو جائے۔ تستر کل دنیا تو نہیں؟ مگر کون سی زمین اس کو پناہ دے گی۔ یہ زمین خدا نے بنائی ہے، اسے بھی اور اسکو آزادی نہ تھی۔ اس کی روح اتنی بے چین کیوں ہو گئی تھی؟ وہ اس محبت میں اپنے آپ کو فنا کر دینا چاہتا تھا۔"١٨

حسین بن منصور کی روح جس قدر بے چین تھی وہ خود بھی اس راز کو پانا چاہتا تھا۔ حسین گیتوں کے ذریعے اپنے دادا محمی کی عبادات اور ان کی جلنے والی آگ کو اپنے سینے میں بھی محسوس کرتا مگر اس بات پر آکر رک جاتا کہ

اس آگ کا مقصد تو دادا کو معلوم تھا لیکن میرے سینے میں جلنے والی آگ کا راز معلوم ہی نہیں۔ حسین ان سب باتوں کی وجہ سے پریشان تھا اور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ سب باتیں کس کو بتائے اور ان کا جواب کس سے پائے۔

"وہ گیت بار بار اس بجلی کے لہریے کی طرح جو بادلوں کی سیاہی کو لحظہ لحظہ روشن کرتی ہے، اسے کیوں یاد آرہا تھا۔ اس کے دادا نے آگ کی پوجا کی تھی۔ آگ جو دکھائی دیتی ہے، لپکتیہے، شعلہ بنتی ہے، جلاتی ہے۔ مگر اس کے جی کے اندر یہ آتش سوزاں کس کے لیے تھی؟ وہ کس سے کہے؟، کیسے بتائے؟"۱۹

حسین بن منصور ان سب سوالوں کی وجہ سے پریشان تھا اور ہر لمحہ اس سے سوال کرتا تھا اور ہوا کا ہر جھونکا اسے چھو کر گزرتا تھا۔ اسے دن میں سکون تھا نہ رات میں راحت تھی۔ اس کے اندر جو آگ لگی تھی وہ اس کے ہاتھوں پریشان تھا۔ اب وہ تستر میں خود کو مقید سمجھتا تھا اور ہر بات کے جواب کے لیے وہ یہاں سے فرار چاہتا تھا۔

"ان ساری آوازوں سے اپنے کان بند کرنے پر بھی کوئی مفر نہ تھا۔
تستر سے اور آوازوں سے بچنے کے لیے وہ بصرہ بھاگ گیا۔"۲۰

ج۔ حسین بن منصور کی محبت کی راہ میں رکاوٹیں اور مخالفت

حسین بن منصور تستر سے نکلتے ہی بصرہ کی طرف جاتے ہوئے ایک عیسائی قافلے میں شامل ہو گیا۔ بصرہ اس وقت علم و ہنر کا مرکز تھا۔ بصرہ میں علمی درس گاہیں، خانقاہیں اور مذہبی مراکز تھے۔ اس لیے دور دراز کے خطوں سے لوگ بصرہ کا رخ کرتے تھے۔ حسین بن منصور جس نسطوری قافلے میں شریک ہوئے تھے انھوں نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور بغیر کچھ پوچھ گیچھ کیے اپنے قافلے میں شامل کر لیا مگر بہت سی باتوں سے باز رہنے کو بھی کہا۔ سفر کے آغاز میں حسین بن منصور کو کچھ شرائط بتائی گئیں۔

"سالارِ کارواں نے اسے اپنے ساتھ شامل کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''تم ابھی کمسن ہو اور کچھ تجربہ نہیں رکھتے۔ اس لیے تم ہمارے ساتھ تو چل سکتے ہو مگر سننے کے بعد بولنے کی مناہی ہے، دیکھنے کے بعد کہنے کی مناہی ہے، ٹوہ لینے اور راز جاننے کی مناہی ہے۔ ہم صرف اناج کھاتے ہیں اس لیے تمھیں گوشت نہیں مل سکے گا۔ جہاں قافلہ اترے وہاں تمھیں

مزدوری کرنے کی اجازت ہے مگر ہمارے ساتھ رہتے ہوئے تمہیں اس کی ضرورت پیش
نہ آئے گی۔"۲۱

اس قافلے کے ساتھ سفر کرتے ہوئے حسین بن منصور کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ قافلے کے لیے پانی لایا کرے گا۔ حسین قافلے کے بیچ رہتا مگر کسی طرح کا نہ سوال کرتا اور نہ کچھ بتانے کی کوشش کرتا اس طرح حسین بن منصور کا سفر گزرتا گیا۔ حسین جب کبھی اپنے کام سے فارغ ہو جاتا تو وہ حوض کے کنارے آکر بیٹھ جاتا اور حوض میں بننے والے چاند کے عکس کو دیکھتا رہتا۔ یہ وہ مقام اور ایام تھے جہاں سے حسین بن منصور اور اغول کی آنکھیں چار ہوئیں۔ حسین اور اغول کا عشق کیا تھا؟ اغول کو حسین میں کیا نظر آیا تھا وہ کوئی اتنا طاقتور انسان نہیں تھا کہ جس سے اغول کو یہ لالچ ہوتا کہ یہ مجھے خرید لے گا۔ حسین کسی مستقل ٹھکانے کا مستقعر بھی نظر نہیں آتا تھا جہاں اغول حسین کو دوبارہ تلاش کر سکتی اور ایک دوسرے کو دیکھ سکتے۔ مگر اغول کی آنکھوں نے حسین کو پہچان لیا تھا۔ اغول ایک محبت کرنے والی اور حقیقی محبت کو سمجھنے والی خاتون تھی اور وہ حسین کی قدر جانتی تھی اس لیے اس نے جسموں کی دوری کو اہمیت نہیں دی اور اپنی جان کی قربانی کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ اغول کی حسین سے محبت بھی ایک معجزہ تھی۔

"پتہ نہیں اغول کو راہ چلتے چلتے ٹھوکر کیسے لگی تھی۔ وہ حسین میں کیا دیکھ کر
اس کی محبت میں گرفتار ہوئی۔ اور ایک لمحے نے انہیں جدا بھی کر دیا تھا۔ فراق
کے التہاب نے اسے رنج اور سرخوشی دونوں جذبے دیے تھے۔ محبت کی اعلیٰ و
ارفع منزل کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ اس وجود کا وہ کیا کرے جو قربانی کے جذبے اور
منزل کے درمیان کہیں سے آموجود ہوا تھا۔"۲۲

حسین بن منصور نے ان آنکھوں کو سب سے خاص اور پر راز سمجھا لیکن ان کی قدر اس قافلے کو نہ تھی۔ اغول حسین سے سوال جواب کرتی مگر ان جوابات میں بے توجہی تھی اور کسی قسم کی دلچسپی نظر نہیں آتی تھی۔ اغول نے حسین بن منصور سے پوچھا کہ ہمیں کہاں لے جایا رہا ہے اور کیوں لے جا رہے ہیں تو اس پر بھی حسین نے بے ربطگی کا مظاہرہ کیا تو اغول نے حسین کو کہا انسانوں کو پڑھنا سیکھو کیونکہ یہ خدا کی سب سے اعلی مخلوق ہے۔ یہ وہ پہلا نکتہ تھا جس نے حسین کو اس عورت میں کچھ منفرد دکھایا۔ اغول حسین کو نصیحت کرتی ہے۔

"سب سے اعلی مخلوق انسان ہے اور اگر خدا توفیق دے تو اسے ضرور غور
سے دیکھو۔ ہو سکتا ہے خدا کا جلوہ کسی طور کسی چہرے کسی سراپے میں تمہیں
دکھائی دے۔"۲۳

اغول نے حسین کو انسانوں کو دیکھنے اور ان میں دلچسپی لینے کا کہا تو حسین نے نظر اٹھا کر اغول کو دیکھنا شروع کر دیا اور چہرے پر نظر پڑتے ہی اغول کا تمام جسمانی اور روحانی حسن حسین کی آنکھوں میں ٹھہر گیا۔ حسین ،اغول کے حسن اور پر راز آنکھوں سے حیران ہوا تھا۔ اغول نے مسکرا کر کہا میں نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ مجھے ہی دیکھنا شروع کر دیں کیونکہ میرا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہے۔ اغول جانتی کہ بصرہ پہنچ کر مجھے فروخت کر دیا جائے گا اور میں کسی محل میں کنیز بن کر رہ جاؤں گی۔ اغول اپنی اس حیثیت سے افسردہ ہو گئی اور حسین کے پوچھنے پر اغول نے کہا:

"اس لیے کہ بصرہ سے ہم بغداد کے لیے روانہ ہوں گے۔ مجھے کنیزوں کے
سوداگروں کے پاس بیچ دیا جائے گا۔ پھر میں کسی حرم کی محل کی چار دیواری
میں بند ہو جاؤں گی اور یہی میری زندگی ہو گی۔"۲۴

اغول نے کھل کر یہ بات بتادی کہ یہ ہمارا مقدر ہے کیونکہ ہمیں تیار ہی اس لیے کیا جاتا ہے ہم مسلمانوں کے گھروں میں جا کر ان کی آنے والی نسلوں کی رگوں میں عیسائیت کا خون گھول سکیں اور اس سے اسلام کمزور ہو۔ حسین بن منصور نے افسردگی کے عالم میں اغول کو کہا کہ تمہاری ماں بھی اس معاملے تمہاری مدد نہیں کر سکتی؟ تو اس پر اغول نے کہا کوئی بھی میری مدد نہیں کر سکتا:

"نہیں کوئی بھی نہیں، خدا بھی نہیں۔ اپنے مقدر سے بھاگ کر کوئی کہاں
جا سکتا ہے؟ کوئی ہماری مدد نہیں کر سکتا۔"۲۵

حسین بن منصور یہ سب باتیں سن کر بہت حیران ہوا کہ آخر اغول مجھے یہ باتیں کیوں بتا رہی ہے۔ اغول بھی حسین کی پر راز طبیعت جان گئی تھی اور چاہتی تھی کہ حسین آنے والے وقت میں اسے یاد رکھ سکے اور اس کے لیے دعا کر سکے۔ اغول کا مقدر اور یقین دیکھ کر حسین کو یاد آیا کہ اس کے شیخ نے کہا تھا: مقدرات جو ہیں، ان پر خوش رہو۔ حسین بن منصور شخصی آزادی کے حق میں تھا اور چاہتا تھا کہ انسان اپنے مقدر کے بدلنے کے لیے

کوشش کرے کیونکہ خدا کی اس وسیع و عریض کائنات میں اتنا مقہور و مجبور کیوں ہو، حسین کیوں مجبور ہو، اغول کیوں مجبور ہو اور ہر ذی روح مجبور کیوں۔

بصرہ میں اترتے ہی حسین نے اپنے اندر ایک دوسرے حسین کو دریافت کیا اور وہ حسین، اغول تھا جو ہر وقت اس کے دل میں خون کی طرح موجزن تھا اور اس کے چہرے پر ہر وقت اس کا عکس دیکھا جا سکتا تھا۔ بصریکے دروس تستر سے بڑے اور زیادہ پر مغز تھے اور یہاں طالب علم زیادہ انہماک کے ساتھ کام کرنے میں لگے رہتے تھے مگر حسین تھا جو دینی دروس کی اشکال اور فلسفے کی گھتیوں سے بہت دور نظر آتا تھا اور ہر وقت کھویا رہتا اور یوں لگتا کہ وہ کسی گہرے راز کا متلاشی ہے۔

"وہ اغول کو ایک نظر دیکھنے کے لیے اپنے آپ کو لٹانے کے لیے تیار تھا اس
کی جاںپر سوز اور دلبے تاب، اس کی خواہشیں، کیا وہ دیوانہ ہو گیا تھا؟"۲۶

محبت چیز ہی ایسی ہے کہ جس کے بعد انسان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اغول کی بھی یہی حالت ہوئی وہ بغداد پہنچ کر ہر وقت حسین کو یاد کرتی رہتی اور اس کے عشق میں جلتی رہتی تھی۔ اغول ایک کنیز تھی اور کھل کر عشق کا اظہار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ حسین کا چہرہ تک اغول کو نظر نہیں آتا تھا۔ اوراغول کے پاس رہنے والی دوسری کنیز دلشاد بھی اغول کو جب دیکھتی تو پریشان ہو جاتی اور وہ اغول کو کہتی حسین کو بھول جاؤ کیونکہ عشق تو دیکھنے، ملنے اور جذبات کے تبادلے کا نام ہے اور جس کو آپ دیکھ نہیں سکتی اس سے عشق کیسے ہو سکتا ہے۔

"دلشاد نے کہا: ''یہ بیماری ہے اغول ورنہ عشق تو دیکھنے بھالنے ملنے کی کیفیت ہے۔
اغول بہت دیر خاموش رہی پھر نہایت رازداری سے اس نے کہا: وہ عمیق ترین خلوتوں
میں ہوتا ہے بحر محیط کی طرح اس کا وجود میرا احاطہ کیے ہوئے ہے۔"۲۷

حسین کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ وہ محبت میں اس قدر غرق تھا کہ کھانے پینے اور سونے پہننے کی اسے کچھ یاد نہیں رہتی تھی۔ حسین بن منصور سبق یاد کرنے اور فلسفے کی گھتیاں سلجھانے میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ حسین پر اس محبت کے اثرات شاید دوسروں سے بھی کچھ زیادہ ہی شدید تھے۔ اغول سے ملاقات کے بعد اب اس کا زیادہ تر وقت تنہائی میں گزرتا تھا اور کسی سے بھی بات چیت کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ بصرہ آئے ہوئے حسین کو

ایک عرصہ گزر گیا تھا مگر اپنے والدِ محترم کو کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ حسین تو شاید اغول کی محبت میں اس قدر کھو گئے تھے کہ والدِ محترم کو یاد نہ کر سکے مگر منصور جو ایک باپ کا دل رکھتا تھا وہ حسین سے دوری برداشت نہیں کرتا تھا وہ تو تستر بھی اپنے بیٹے کے پیچھے جاتا رہتا تھا اور بصرہ تو تستر سے بہت زیادہ دور تھا اور پھر حسین کو وہاں سے آئے ہوئے بھی ایک مدت بیت گئی تھی۔ منصور سے جب نہ رہا گیا تو اس نے بصرہ کے لیے کمر باندھی اور سفر کی مشکلات برداشت کرتے ہوئے آخر بصرہ پہنچ گیا۔

"جب بالآخر منصور اسے جگہ جگہ ڈھونڈتا منزلیں مارتا تھکا ہارا بصرہ پہنچا ہے تو
حسین دفتر کے دفتر سیاہ کر چکا ہے۔ ویران بستیوں کے نوحے، زردی مائل چاندنی
سنہرے بالوں پر اترتی ہوئی گیتوں میں ڈھلتی ہوئی قافلہ سالاروں اور حدی خوانوں
نغمے۔"۲۸

یہی وہ ایک طریقہ تھا جس کے ذریعے حسین اپنے جذبات اندر سے باہر نکال سکتا تھا اور پھر یہ کاغذ حسین کی باتوں کا بوجھ اٹھا بھی سکتے تھے۔ ایک طرف اغول کا عشق اور دوسری طرف گنج نامہ کا مطالعہ ان باتوں نے حسین بن منصور کو لکھنے پر اکسایا تھا۔ اس وقت حسین ایک دل گداز قلم کار کے روپ میں سامنے آئے۔ حسین بن منصور بھی جانتے تھے کہ اسے اپنی باتوں کو کاغذ پر محفوظ رکھنا چاہیے تاکہ وہ دوسرے بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ حسین کے لکھنے کی وجہ جہاں دنیاوی نظر اغول بنی تھی وہیں روحانی فلسفہ بھی اس میں کارفرما تھا اور اس جذبے نے حسین سے بہت سی کتابیں لکھوا ڈالیں اور شاعر بھی بنا دیا۔ اس حوالے سے ذہین شاہ تاجی اپنی کتاب ''کتابالطواسینلمنصور حلاج'' میں لکھتے ہیں:

"شیخ غوث بہاں باقلی جنھوں نے کتاب الطواسین کا عربی سے فارسی میں ترجمہ
کیا ہے، اور جنھوں نے منصور کی سطحیات کی شرح بھی کی ہے، ان کا بیان ہے کہ
منصورؒ کی ایک ہزار تصانیف تھیں، جن کو ان سے حسد رکھنے والوں نے جلا دیا۔
منصور اپنے زمانے میں شہرہ آفاق شاعر اور ادیب تھے، ان کا کلام نہایت
بلیغ اور دقیق ہوتا تھا۔"۲۹

منصور نے اپنے جگر کے ٹکڑے کو دیکھا تو اس کے دل کی دنیا اور بھی اداس ہوگئی۔ منصور اپنے بیٹے کی حالت کو سمجھ تو گیا تھا مگر وہ چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا اپنے باپ کو اپنے غم خود سنائے مگر حسین تو ہر وقت اداس اور خاموش رہتا تھا۔ منصور سے اپنے بیٹے کی حالت برداشت نہ ہو سکی تو اس نے کہا بیٹا، تم میرے ساتھ بیضا چلو وہاں تمھاری ضرورت ہے اور تم میرے ساتھ کاروبار میں مدد کرو۔ حسین نے اپنے باپ کے ساتھ بیضا جانے کے لیے رضامندی کا اظہار نہ کیا اور اٹھ کر دروس کے لیے چلا گیا۔ حسین کے اس رویے نے منصور کو اور بھی پریشان کر دیا تھا۔ حسین کے کمرے سے نکلتے ہی منصور نے حسین کی تحریر کردہ کتابوں میں ایک کتاب اٹھائی تو وہاں سے وہ اصل راز مل گیا جس نے حسین کو منصور کے ساتھ جانے سے عاجز کر دیا تھا۔

"اس کے جانے کے بعد دیر تک منصور سوچتا رہا۔ پھر اٹھ کر اس نے یونہی کتابیں دیکھنے کے لیے کھولیں تو اس نے وہ گنج شائیگاں جسے حسین نے ہر فانی نگاہ سے چھپا کر بالکل محفوظ رکھا تھا۔ محبت کا گہرا اور مندمل نہ ہونے والا زخم اس کے بیٹے کو لگ کیسے گیا؟ وہ سوچتا رہا" ۳۰

حسین کی حالت منصور کی برداشت سے باہر ہوگئی تھی اور حسین کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے تھے مگر حسین پر ان باتوں کا کوئی خاص اثر نہیں ہو رہا تھا۔ آخر منصور نے اپنے بیٹے کا دل نرم کرنے کے لیے کہا کہ بیٹا تمھارے ماموں کی بیٹیاں تمھیں دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں پس تم میرے ساتھ چلو سب خوش ہوں گے۔ منصور کی ان سب باتوں پر حسین خاموش رہا اور یہ خاموشی بیضا جانے سے انکار کا اشارہ تھی۔ منصور بھی ان سب باتوں پر خاموش نہ رہ سکا اور کہہ دیا بیٹا تم بہت لاغر ہو گئے ہو اور اپنی صحت کا کچھ تو خیال رکھو۔ حسین کے دل پر جو چوٹ لگی تھی اب اس کے آثار دل سے نکل کر حسین کے چہرے اور جسم سے بھی عیاں ہونے لگے تھے۔

"تم نے محسوس نہیں کیا تم کتنے لاغر ہو گئے ہو۔ تمہار رنگت زردی مائل سیاہ ہو گئی ہے اور ہاتھوں کی ہڈیاں پتلی کھال میں سے صاف دکھائی دیتی ہیں۔" ۳۱

حسین بن منصور اب اغول کے عشق میں مکمل طور پر گرفتار ہو چکا تھا۔ وہ اپنے دل اور اپنی ذات سے بے پناہ محبت کرتا تھا مگر اغول کو دیکھ لینے کے بعد وہ اپنی ذات سے بھی لگاؤ بھول چکا تھا۔ حسین بن منصور ایک نظر اغول کو دیکھنے کے لیے بے تاب رہتا تھا۔ جب وہ اس کیفیت سے تنگ آ جاتا تو سوچتا کہ یہ تو صرف میری غلطی ہے

جو میں اس کو اپنے دل میں بسا چکا ہوں اور شاید اُس کے دل میں ایسی کوئی بات نہ ہو۔ حسین بن منصور اپنے یک طرفہ فیصلے سے پریشان بھی تھا اور اغول کی محبت میں گرفتار بھی تھا۔ حسین بن منصور محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ سوچتا کہ کاش اس نے کبھی اغول کو دیکھا ہی نہ ہوتا اور اغول نے اس سے بات ہی نہ کی ہوتی۔ حسین بن منصور سوچتا تھا کہ اغول کی ایک ملاقات اسے بھول نہیں پا رہی اور وہ اب تک اسی سحر میں ہے مگر وہ اُسے ایک نظر اور دیکھ لے تو اس کا ویران دل پھر سے آباد ہو سکتا ہے۔

"پانی پر حبابوں کے قافلے رواں تھے، خالی پیالے اوندھے۔ تو اب اس کا دل بھی اغول کی یاد کے بنا یوں ہو گا، خالی۔ خالی۔ کیا وہ اس ویران دل کو برداشت کر سکے گا۔ اسے لگا جیسے وہ ایک کھنڈر کے کنارے کھڑا شاعر ہے اور محبوب کی بستی کے پاس کھڑا رو رہا ہے۔" ۳۲

حسین بن منصور آخر اس عشق کے درد کو اپنے سینے میں چھپائے عراق پہنچ کر خلیفہ کے دربار سے منسلک ہو جاتا ہے۔ یہی وہ طلب اور تڑپ تھی جس نے حسین بن منصور کو عاشق صادق بنا دیا اور اسی جھلک کو وہ شعلہ سمجھ کر موسیٰ کی طرح طور کی طرف رواں ہو گیا تھا۔ حسین اپنے رب کی ذات تک جیسے پہنچنا چاہتا تھا اس کے لیے ایسے ہی بے مثال عشق کی ضرورت تھی۔

د۔ حسین بن منصور پر سیاسی دباؤ

حسین بن منصور کو جب دو حرقہ میں دربار کے لیے چنا گیا تو اس نے اس انتخاب پر کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہ کیا کیونکہ حسین بن منصور جانتا تھا کہ جس مقصد کے لیے وہ نکلا ہے وہ اس دربار میں رہ کر پورا نہیں ہو سکتا۔ حسین بن منصور مزاجاً ایک آزاد پنشی تھا اس لیے اسے کسی قسم کی قید پسند نہ تھی اور وہ اپنے مزاج کے مطابق رہ کر اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

"برخوردار! کیا تم دربار سے منسلک ہونا پسند کرتے ہو؟ دربار ایک الگ دنیا ہے۔ ایک تاریک سمندر ہے جہاں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کونگل جاتی ہیں۔" ۳۳

حسین بن منصور خلیفہ کے دربار سے وابستہ ہو گیا اور خلیفہ کا قرب مل گیا۔ حسین کو خلیفہ کے قرب میں جو مقام مل گیا تھا بہت سے لوگ اس سے جلنے لگے تھے اور ان میں سے ایک خلیفہ کا خاص وزیر حامد بھی تھا۔ حامد نے

حسین کو ورغلانے کے لیے لونڈیوں کے چکر میں پھنسانے کے لیے بہت سی باتیں سنائیں مگر حسین نے ان میں سے کسی بات پر بھی توجہ نہ دی۔ حسین کے پاس ان سب باتوں کے لیے وقت نہیں تھا اور وہ ان فضول کاموں میں پڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ حسین سمجھتا تھا کہ دربار کی لونڈیوں پر آنکھ ٹکانا جرم کے ساتھ ساتھ خلیفہ کے ساتھ بے وفائی کا ثبوت بھی ہے۔ حامد نے جب حسین بن منصور کی طبیعت میں ایسی بدمزاجی دیکھی تو وہ حسین سے چڑ رکھنے لگا۔

"تم اتنے بدمذاق ہو۔ مجھے معلوم نہیں۔ حامد نے جل کر کہا۔"۳۴

یہ وہ مقام تھا جہاں سے حسین پر سیاسی دباؤ کا آغاز ہوتا ہے۔ حامد اور حسین کے درمیان سرد مہری نے جگہ لے لی اور اس کے بعد حامد اور حسین بن منصور کے درمیان دشمنی تو نہ ہوئی البتہ محبت اور دوستی یا خلوص کا رشتہ بھی قائم نہ رہا۔

حسین بن منصور نے خلیفہ کے دربار سے وابستہ رہتے ہوئے حضرت عثمان مکی کی خانقاہ میں جانا شروع کر دیا تھا۔ حضرت عثمان مکی جانتے تھے کہ مکمل طور پر توجہ کے بغیر فلسفے کی گتھیاں نہیں سلجھائی جاسکیں گی۔ اس لیے انھوں نے حسین بن منصور سے کہا کہ دربار سے وابستہ رہتے ہوئے یہ کام نہیں سیکھا جاسکتا۔ حضرت عثمان مکی نے حسین سے یہ بھی پوچھا کہ تم نے تستر کو کیوں چھوڑا؟ حسین بن منصور نے ان سب باتوں کو سن کر ایک ہی فیصلہ کیا کہ وہ دربار کو چھوڑ دے گا۔ حسین چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ اپنا مطلوبہ راز پالے۔

"میں دربار چھوڑ دوں گا۔ آپ مجھے اپنے سائے میں رہنے کی اجازت دیں۔
اس کی عاجزی دیدنی تھی۔ اس کا سارا بدن پانی بن کر، خاک بن کر، ہوا بن کر
ان کے قدموں میں تھا۔"۳۵

حسین بن منصور نے عمر بن عثمان کے دروس میں شرکت کی اور شیخ صاحب کی طبعت سے بہت متاثر ہوئے۔ شیخ صاحب کے دروس کے دوران حسین بن منصور نے ایوب بن اقطع کے پاس جانا بھی شروع کر دیا تھا اور اس پر اکثر عمر بن عثمان ناراض بھی ہو جاتے۔ حسین بن منصور نے شیخ صاحب کی باتوں کا برا نہیں مانا تھا مگر ان کی بات کو مانا بھی نہیں تھا۔ حسین بن منصور نے اپنے والد کو زبردستی اس بات پر مجبور کر کے ایوب بن اقطع کی بیٹی زینب سے نکاح کر لیا تھا مگر یہ نکاح تو صرف زینب کے لیے ہی تھا کیونکہ حسین تو ایک آزاد روح تھا اور کسی بھی قید میں رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ حسین بن منصور اپنی بیوی کے سامنے بیٹھا بیٹھا دیوانہ وار ہنسنے لگتا اور وہ یہ سب دیکھ کر

حیران ہو جاتیں کہ مجھے جو شریکِ حیات ملا ہے وہ کسی طرح بھی میری پرواہ نہیں کرتا۔ حسین بن منصور بیٹھے بیٹھے کھو جاتا اور اکثر اوقات پریشان بھی رہتا تھا۔ نکاح سے پہلے تو عمر بن عثمان ان کا حال دریافت کرتے تھے مگر نکاح کے بعد وہ بھی ان کی طرف نہیں آتے تھے۔

"عقد سے پہلے تو عم بزرگوار عمر بن عثمان اس کے سر پر دستِ شفقت رکھتے
تھے مگر اب وہ بھی ان کے ہاں نہیں آتے تھے۔ وہ کس سے کہے اور اس نے
جینے سے کیا پایا تھا۔ وہ کس سے کہے کہ اس جینے سے تو موت اچھی تھی۔"۳۶

حسین بن منصور کی طبیعت اور رویے کو دیکھ کر ان کی بیوی بھی یہ بات سمجھ گئی کہ یہ زندگی بڑی مشکل ہو جائے گی کیونکہ زینب کو اپنی آزادی، ہمجولیوں کے ساتھ خوش گپیاں یاد آتی تھیں اور اِدھر حسین بن منصور ان سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ زینب کو شیخ عمر بن عثمان کی کہی ہوئی باتیں یاد آنے لگیں کہ وہ ٹھیک ہی کہتے تھے کہ یہ نباہ نہیں ہو سکتا کیونکہ حسین بن منصور ہر وقت اپنی طبیعت میں مگن رہنا اور بہت سی گتھیاں سلجھانا چاہتا تھا۔

"عمر بن عثمان ٹھیک ہی کہتے تھے یہ نباہ کہاں ہو سکتا تھا۔ وہ بے قرار روح
کی طرح تڑپتا ہوا، بے پناہ آنکھوں والی بے چین نگاہوں سے ہر طرف
متلاشی اور گم کردہ راہ بھی۔ وہ شکایت کس سے کرے۔"۳۷

حسین بن منصور اب شیخ عمر بن عثمان کے دروس میں بھی شریک نہیں ہوتا تھا بلکہ الگ بیٹھ کر کچھ اشکال کا حل نکالنے میں مگن رہتا تھا۔ شیخ صاحب حسین بن منصور کی یہ مصروفیت دیکھ کر بہت غصے میں آگئے اور وہ جانتے تھے کہ حسین بن منصور ان گتھیوں کو کیسے سلجھائے گا؟ اس کے پاس تو شوق کے ابتدائی مراحل کا بھی علم نہیں اور یہ تو بہت مشکل گھاٹی ہے۔ حسین بن منصور نے شیخ صاحب کا گنج نامہ ان کی اجازت کے بغیر اٹھا کر اس کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ گنج نامے کی خبر ملنے پر شیخ صاحب شدید غصے میں آگئے اور ان کو یوں لگا جیسے ان کے پورے جسم میں ایک جھٹکا سا لگا ہو۔ شیخ عمر بن عثمان مکی نماز کے لیے وضو کر رہے تھے جب حسین نے ان کا گنج نامہ اٹھایا اور اُن کو اس واقعے کا پتا چل گیا اور پھر انھوں نے حسین کو یہ بد دعا دی۔ اس حوالے سے شیخ عطار "تذکرۃ الاولیاء میں لکھتے ہیں:

> "آپ کی جانماز کے نیچے گنج نامہ کا ترجمہ رکھا ہوا تھا اور جب آپ وضو کے
> لیے اٹھے تو کوئی چرا کر لے گیا آپ نے دورانِ وضو ہی فرمایا کہ لے گیا لیکن
> جو بھی لے گیا ہے اس کے دست و پا قطع کر کے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ اور
> اس کو نذرِ آتش کر کے راکھ تک اڑا دی جائے اور اس کو گنج نامہ سے اس لیے کوئی
> فائدہ نہ پہنچ سکے گا کہ وہ اس کے بھید تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔"۳۸

یہی وہ بد دعا تھی جس نے حسین بن منصور حلاج کی روح کو آخری دم تک بیقرار رکھا اور پھر اس بد دعا نے حسین بن منصور حلاج کو پھانسی کے پھندے تک پہنچا دیا۔

یہ وہ سب کام تھے جن کو کر کے حسین بن منصور اپنی منزل تلاش کرنا چاہتا تھا۔ حسین بن منصور کے ماتھے پر جو روشنی تھی وہ اس بات کی عکاس تھی کہ حسین بن منصور اپنی منزل خود تلاش کرے گا وہ جس مقصد کے لیے رواں دواں ہے وہ اس کو تلاش کر کے رہے گا۔ حسین بن منصور نے جب شیخ عمر بن عثمان کے دروس میں شرکت کرنا چھوڑ دی تو پھر نئے در کی تلاش میں نکل پڑے۔ حسین بن منصور کی قسمت میں نہ تھا کہ وہ عمر بن عثمان کی راہ پر چلتے اور ان کے طریقے کو قبول کرتے۔

جنید بغدادی کے درس میں شمولیت:

حسین، شیخ عمر بن عثمان مکی کے درس سے نکلے تو کسی اور درس کی تلاش میں ہو گئے اصل میں وہ چاہتے تھے کوئی ایسا درس ملے جہاں سے ان کی روح کی غذا ملے اور وہ جس مقصد کے لیے مارے مارے پھر رہے ہیں وہ پورا ہو جائے۔ بغداد میں جنید بغدادیؒ کے علم کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ مدرسہ نظامیہ کے استاد اعلیٰ اور بے بدل استاد مانے جاتے تھے۔ وہ شریعت و طریقت اور دنیاوی علوم سے مکمل شناسائی رکھنے والے استاد مانے جاتے تھے۔ ان کا چرچا سن کر حسین بن منصور جنید بغدادی کے دلدادہ ہو گئے۔

> "حسین عمر بن عثمان کے دروس سے مراجعت کی اور اقطع سے مشورہ کر کے
> حضرت جنیدؒ کے حلقہء ارادت میں شامل ہونے کے لیے حاضر ہوا۔"۳۹

حسین بن منصور جب حضرت جنیدؒ بغدادی کے درس میں شامل ہو گیا تو تب بھی اُس پر غشی کا اثر رہتا تھا اور کبھی کبھی وہ اثر شدید ہو جاتا اور یوں لگتا کہ وہ بہت زیادہ پیے ہوئے ہیں۔ حضرتجنید بغدادیؒ ان کی حالت دیکھتے

تو کتنی دیر تک غور سے دیکھتے ہی رہتے اور اس بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ آخر اس نوجوان کی حقیقت کیا ہے! حسین بن منصور خود کو خدا کی ذات میں غرق کر دینا چاہتا تھا اور یہی اس کا مقصد تھا اور تمام رازوں کا اصل اور بنیادی راز تھا۔

"شیخ الشیوخ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: ''یہ کیا ہے''حسین نے اپنے جھومتے ہوئے سر کو سنبھالنے کی کی کوشش میں کہا: ''میں ذات الٰہی میں فنا ہونا چاہتا۔ نظارگی میں میری ہوشیاری اور سرمستی حائل ہے۔"۴۰

جنید بغدادیؒ حسین بن منصور کی یہ بات سن کر بہت ہنسے اور حسین بن منصور کو بھی ان کی ہنسی دیکھ کر اس بات کا احساس ہو گیا کہ وہ غلطی پر ہے۔ جس راہ کا وہ متقاضی ہے شاید وہ ابھی بہت دور ہے اور اس پر چلنے کے لیے مزید جان کنی کی ضرورت ہے۔ حسین بن منصور گنج نامہ چرا کر یہ سمجھا تھا کہ اب وہ گرہیں کشا کر لے گا۔ حسین بن منصور اس غلط فہمی میں بھی شاید تھا کہ اس گنج نامہ کو سمجھنے کے لیے اسے کسی استاد کی ضرورت بھی نہیں۔ حسین بن منصور جنید بغدادیؒ کی سرزنش سن کر گھبرا گیا اور وہ سمجھا کہ وہ کوئی صریح غلطی کر چکا ہے اور اب اسے اس کا ازالہ کرنا پڑے گا۔ جنید بغدادیؒ نے حسین بن منصور کو کہا:

"تم جن منزلوں کا ذکر کرتے ہو۔ جن پر ہونے کا تمہیں دعویٰ ہے ابھی تم کو ان راستوں پر چلنے والوں کی گردِ راہ تک کی خبر نہیں، بہروپئیے بن کر خلقِ خدا کو گمراہ مت کرنا، پہلی شرط تمہاری تربیت ہے۔"۴۱

حسین بن منصور حضرت جنید کے ساتھ بھی زیادہ دیر تک نہ رہ سکا کیونکہ ایک دن حسین بن منصور پر اغول کے عشق کا دورہ پڑا اور جسے دیکھ کر حضرت جنیدؒ بھی حیران ہو گئے اور انھوں نے پانی پھونک کر حسین بن منصور کو کئی بار پلایا تب جا کر وہ ہوش میں آیا۔ اس حالت کو دیکھنے کے بعد حضرت جنیدؒ بھی سمجھ گئے کہ یہ واقعی ہی راہِ حق کا متلاشی ہے اور یہ جگہ اس کے لیے ٹھیک نہیں اور اگر حسین یہاں رہے گا تو مذاق بن جائے گا تو اس پر انھوں حسین کو سمجھایا کہ تم بیضا واپس چلے جاؤ اور وہاں اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر تستر چلے جانا۔ تستر میں شیخ سہل عبداللہ تستری کی ذرا سی توجہ بھی حسین بن منصور کے لیے آسانیاں پیدا کر سکتی تھی۔

ا۔ حسین بن منصور سے حسین بن منصور حلاج تک کا سفر:

حسین بن منصور تستر پہنچ گئے۔ سہل عبد اللہ تستری منصور کی حالت اور اس کا شوق دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہ جس راہ کی سختیاں برداشت کر رہا ہے یہ واقعی اس منزل پر پہنچ کر ہی دم لے گا۔

"قریب آؤ" انہوں نے اسے کہا۔ وہ نہایت سہما ہوا اور ادب سے تقریباً
دہرا ہو کر حجرے میں داخل ہوا۔ "حسین بن منصور تم طالب راہِ حق ہو۔"
اس نے وہیں زمین کو بوسہ دیا اور شدت گریہ سے اس کی آواز بند ہوئی
جاتی تھی۔"۴۲

حسین بن منصور کی یہ حالت دیکھ کر شیخ سہل عبد اللہ تستری نے ان کو نصیحت کی کہ اپنے نفس کو سزا دو اور جس کٹھن راستے پر چلے ہو اس کا عادی اپنے نفس کو بھی بناؤ۔ جب ان مشکلات کا عادی تم خود کو بنالو گے تو اپنی منزل کے اور قریب پہنچ جاؤ گے۔ حسین بن منصور نے صومعہ سے واپس آکر تستر میں سہل عبد اللہ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے روئی دھننے کا کام شروع کر دیا اور بہت جلد اس کام میں ماہر ہو گئے اور پورے بازار میں تمام دکانداروں کے دل میں جگہ بنالی۔ حسین روئی دھننے کا کام اتنی محنت سے کرتا کہ دیکھنے والے کہتے کہ یہ اکیلا دس لوگوں کے برابر کام کر لیتا ہے۔

منصور چاہتا تھا کہ حسین بن منصور حلاج واپس بیضا آجائے کیونکہ اس کی بیوی اور بچہ اداس رہتے ہیں ۔بازار کے لوگوں نے منصور اور سیاوش سے کہا کہ آپ اسے واپس لے کر نہ جائیں کیونکہ یہ ہمارے لیے اور ہمارے کام کے لیے برکت کا باعث بنا ہوا ہے۔ منصور چاہتا تھا کہ حسین ان کے ساتھ واپس بیضا جائے کیونکہ عبادت کی اہمیت بجا ہے مگر دنیا بھی اتنی کم تر نہیں کہ اسے ایسے ہی چھوڑ دیا جائے۔ مگر حسین بن منصور حلاج سمجھتا تھا کہ ابھی اس کی تربیت مکمل نہیں ہوئی اور ویسے یہاں بھی وہ دنیا کما ہی رہا ہے وہ الگ بات ہے کہ اپنے باپ کے پیشے سے جدا پیشے پر لگا ہوا ہے۔

"میں روئی دھنکتا ہوں۔ کیا یہ دنیاداری نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ
ریشم میں خوابوں کے مرقعے اور پھولوں کے رنگ بننے کی جگہ میں ریشہ اڑاتا
اور صداؤں میں راگ ڈھونڈ تا ہوں۔ لوگ مجھے حسین حلاج کہتے ہیں۔
حسین بن منصور حلاج؟ــــــ"۴۳

حسین بن منصور حلاج اپنی عبادات میں محو و مگن رہتا اور مقصد صرف اللہ تعالی کی خوشنودی کا حصول تھا۔ حسین بن منصور حلاج جہاں علم و فضل کی تلاش میں حد سے زیادہ محو رہتا تھا وہ اس عبادت کو حقیقت کے راز پانے اور خدا کا قرب حاصل کرنے کے لیے ضروری سمجھتا تھا۔ حسین بن منصور حلاج نے عبادت و ریاضت کا درس بچپن سے ہی گرہ میں باندھ لیا تھا اور حسین کا یقین تھا کہ خدا کی خوشنودی نفل و نوافل اور نفس کی تربیت میں پنہاں ہے۔ حسین بن منصور حلاج کی عبادات کے حوالے سے بابا ذہین شاہ تاجی لکھتے ہیں:

"منصور جہاں علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے، وہاں زہد و ریاضت اور عبادت و طاعت میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ کتاب و سنت کی پیروی اپنے آپ پر لازم جانتے تھے، کم از کم ایک ہزار رکعت، روزانہ نماز ادا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ ایک ہزار رکعت میں اپنے آپ پر فرض سمجھتا ہوں۔"۴۴

حسین کبھی کبھار جب دوسرے لوگوں کو عبادات میں مگن دیکھتا تو سوچنے لگتا کہ مطلب ان کا اللہ تعالی کی خوشنودی حاصل کرنا ہی ہے مگر یہ سب لوگ کس قدر سادگی سے اس کی عبادات میں لگے رہتے ہیں۔ اس سوال کا جواب بھی وہ خود ڈھونڈ تا کہ اس کا مقصد ان سے عظیم اور سوال منفرد ہے اور اس مقصد کے لیے سر کی بازی بھی لگانی پڑتی ہے۔ وہ بھی اپنے خالق کے سامنے سوال کرتا ہے مگر نیاز کے ساتھ ساتھ ناز بھی طلب کرتا ہے۔ اس ناز کے سوال کے ساتھ وہ دل و جان کی قربانی اور روح کی تنہائی اور اذیتوں کے کے ساتھ اپنے رب کے حضور حاضر ہو جاتا ہے۔

"اے میرے خدا، میں حاضر ہوں۔ اپنی جان سے، اور جان کی ساری بیتابیوں سے۔ تنہائی کی اذیتوں سے روح کی ساری پہنائیوں سے، کرب و درد کی ساری اذیتوں سمیت۔"۴۵

حسین بن منصور حلاج کے دل میں تڑپ پیدا ہوئی کہ حج کیا جائے اور وہ اس کے لیے رختِ سفر باندھتا ہے۔ حسین بن منصور حلاج جس قافلے میں شامل تھے وہ لوٹا گیا اور سارے لوگ مارے گئے سوائے حسین بن منصور حلاج کے۔ ایک اور قافلہ آیا جس نے حسین بن منصور حلاج کو اپنے مذہب میں شامل کرنے کی کوشش کی مگر حسین کے مقاصد کچھ اور تھے اس لیے اسے دنیا کے مال و متاع کی ضرورت نہ تھی۔

حسین بن منصور حلاج آخر بے سر و سامانی کی حالت میں اِدھر اُدھر بھٹکتا ہوا مکہ کے قریب ایک غیر آباد سی بستی میں پہنچ گیا۔اُس وقت لوگ حج کر کے واپس لوٹ رہے تھے۔ حسین بن منصور حلاج یہ سمجھتا کہ اگر وہ دوسروں سے اعلیٰ نہیں تو کم از کم جدا ضرور ہے۔ وہ اسی ضد پر اس ویران سی بستی کی ایک مسجد میں ٹھہر گیا اور اسے اس بات کا یقین کا تھا کہ اسے بلایا جائے گا اور وہ تب ہی جائے گا۔

"جب تک میں بلایا نہیں جاؤں گا تو نہیں جاؤں گا۔ قطعاً نہیں جاؤں گا——"۴۶

حسین بن منصور حلاج کو مدینہ میں حاضری کا شرف حاصل ہوا اور وہاں پر اس نے بہت سی دعائیں اور لا تعداد نوافل ادا کیے۔ وہ ایک ہی بات چاہتا تھا کہ اس کی اپنی ذات نہیں ہے اور اِس ذات کو خالقِ باری کی ذات میں گم کر دینا چاہتا تھا۔ حسین بن منصور حلاج جانتا تھا کہ ایک سینے میں دو دل نہیں رہ سکتے ایک دل جو حسین کو سوچے اور دوسرا حسین کے خالق کو سوچے اس لیے وہ چاہتا تھا کہ اس کی اپنی ذات کی پہچان ختم ہو جائے۔ حسین بن منصور حلاج کی اس حالت کو دیکھ کر اہلِ مدینہ بھی ہنس دیتے تھے کہ آخر یہ دیوانہ چاہتا کیا ہے اور اس نے ایسی حالت کیوں بنا رکھی ہے۔

> "اہل صفہ اس کی طرف دیکھتے اور مسکراتے۔ گویا اس حیرت خانہ امروز و فردا میں اس کی جدت طرازی سے محظوظ ہو رہے ہوں۔ اس کی جرات رندانہ پر، اس کی عقلِ ناداں پر اور اس کی بے باکی پر خندہ زن ہوں۔"۴۷

حسین بن منصور حلاج کی وہ ضد بھی پوری ہوئی جس کے لیے وہ ایک مدت سے بے قرار تھا اور چاہتا تھا کہ حج کے لیے اسے بلایا جائے۔ شعبان کی ایک شام خوابیدہ حالت میں آسمانوں کے سات پردے اس کے سامنے نہاں کیے گئے اور اس کی نگاہیں اس کے سامنے دھلائی کر کے اسے لٹائی گئیں۔ اسے رسول پاک ﷺ کی زیارت ہوئی۔

> "اس کی نگاہیں جھکی ہیں مگر اس کی جان کی ساری بے تابیاں اور آتش زدگی اور بے چارگی ایک دم رخصت ہو گئی۔ اسے حکم دیا گیا، نہیں اسے سمجھایا گیا کہ وہ خانہ خدا پر حاضر ہو کر فریضہ حج ادا کرے۔"۴۸

حسین بن منصور حلاج کی جان دھل گئی اور اس کی ساری بے تابیاں جاتی رہیں اور اسے اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ جس مقصد کے لیے وہ ضد کر رہا تھا۔ اب اس کی ذات اپنے خالق کی ذات میں مدغم ہونے جارہی تھی۔ اس کے چاروں طرف ھو، ھو، ھو کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔

۲۔ حسین بن منصور پر پابندیاں

حسین بن منصور حلاج حرم میں ہی تھا جب کچھ کنیزوں نے اسے گھیر لیا کہ ان کے لیے نقش لکھے اور وہ آزادی پا کر اپنے وطن لوٹ جائیں تاکہ وہ اپنی باقی زندگی اپنے وطن میں گزار سکیں۔ حسین بن منصور حلاج ان کے لیے نقش لکھ رہا تھا جب ان کے مرید نے اغول کا نام لیا تو قلم ان کے ہاتھ سے گر گیا اور پلکیں ایک ہی جگہ ٹھہر گئیں اور اسے یوں لگا کہ اسے سردی کے شدید بخار نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اس کی نگاہیں جھک گئیں اور اسے یوں لگا کہ شاید اب وہ کبھی بھی نگاہیں اٹھا نہیں سکے گا۔ حسین بن منصور حلاج کی یہ حالت دیکھ مرید نے اغول کو پھر کبھی آنے کو کہا اور اغول حسین بن منصور کا نام لیتے ہوئے لوٹ گئیں اور دعا کی درخواست چھوڑ گئیں۔

حسین بن منصور حلاج ایک بار پھر اغول کی محبت میں مشغول ہو گیا۔ ایک دم حسین بن منصور کی عبادتیں، ریاضتیں اور مجاہدے سب رخصت ہو گئے اور اغول کے لیے تڑپ اٹھا۔ حسین کے منہ سے اغول کا نام ہی بار بار نکلتا تھا۔ یہ وہی حسین تھا جس کا بدن ایک مدت سے سوکھا پڑا تھا اب لگتا تھا ایک بار پھر اس میں تازگی ایک لہر دوڑ گئی ہے اور اس کے جسم میں ایک لاوے کی آتشی موجود ہے اور اس کی نس نس میں آگ بہہ رہی تھی۔ ایک بار پھر حسین بن منصور حلاج اغول کے لیے تڑپنے لگا اور دیوانہ وار مکے کی گلیوں میں دوڑتا اور اغول سے پہلی بار ملنا یاد کرتا اور اغول کو ایک نظر دیکھنے کے لیے پل پل تڑپتا تھا۔ حسین حرم کی عبادتوں کو چھوڑ کر وادیوں میں نکل جاتا اور ایک ہی جملہ پکارتا رہتا:

"تم مجھ پر اُسے آشکار کرو۔ وہ کہاں گئی۔"۴۹

اغول کا عشق حسین بن منصور حلاج کے لیے ایک ودیعت تھا اور صحرا نوردی کی وجوہات میں سے ایک وجہ اغول بھی تھی جس کے لیے وہ مارا مارا پھرتا تھا۔ حج کے بعد حسین بن منصور حلاج اپنے چاہنے والوں اور مریدوں کے ایک بڑے قافلے کے ساتھ بغداد میں وارد ہوا اور سوچتا ہے کہ جنید بغدادی کے مدرسے کے سامنے

قیام کیا جائے اور ان کو بھی حسین کے انعام کرام کا پتا چل چکا ہو گا ہو گا کیونکہ وہ تو پر دے کی باتوں سے واقفیت رکھنے والے ہیں۔

منصور کا اغول کے عشق میں گرفتار ہونا دوسروں کے لیے نقش لکھنا اور دوسروں کے لیے دعائیں کرنا اور ان سب باتوں سے بڑھ کر منصور جنید بغدادیؒ جیسے بزرگ سے یہ توقع رکھنا وہ بھی ان کے انعام و کرام کے بارے میں جان چکے ہوں گے یہ وہ سب باتیں تھیں جو ان پر پابندیوں اور دوسروں کے دلوں میں نفرت کے بیج بونے کی بنیاد بنیں۔ حسین بن منصور حلاج کے گھر والے بھی ان کو ان کاموں سے باز رہنے کا کہنے لگے۔

> " آپ کیوں چاہتے ہیں کہ وہ یہاں نہ رہے۔ آپ کیوں اس کے مخالف ہیں۔ زینب اور منصور کی وجہ سے۔ ''منصور نے سرگوشی سے پوچھا۔ یہ سب باتیں موت کو دعوت دینے کے مترادف ہیں اور میں چاہتا ہوں وہ زندہ رہے۔ ''اقطع نے جواب دیا۔ "۵۰

حسین بن منصور حلاج کے گھر والے خوب جانتے تھے یہ واقعات اور حسین کی کیفیات ایسی باتیں ہیں جو اس کے لیے خطرے کے باعث بن سکتی ہیں۔ ایسے ہی واقعات کے بعد لوگوں کو پھانسی پر لٹکایا جاتا تھا اور لاشیں جھولتی رہتی تھیں۔ ایوب اقطع کو بچوں اور زینب کی بھی فکر تھی اس لیے وہ اس کو سمجھاتے تھے۔

حسین بن منصور حلاج کی دعاؤں اور مریضوں کو شفا دینے کی خبر خلیفہ کے دربار تک بھی جا پہنچی تھی۔ ان دنوں حسین بن منصور حلاج قرآن کی ایک ایسی تفسیر لکھنے میں مگن تھا جسے لوگ قرآن کا جواب سمجھتے تھے مگر حسین اس کو اللہ کا خاص کرم سمجھتے تھے۔ حسین کا ماننا تھا کہ اللہ نے انسان کو جو عقل دی ہے یہ مقدس کتاب اس کے مطابق استعمال کی جانی چاہیے اور فطرت کی مزید گتھیاں سلجھانے میں معاون ہو سکتی ہے۔ یہ سب باتیں تو حسین کے روحانی قرار کے لیے ضروری تھیں مگر اقطع اور منصور جانتے تھے کہ دربار سے وابستہ لوگ ان کاموں کو کبھی پسند کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے۔

حسین بن منصور حلاج کو حامد بن عباس نے اپنے غلام عمار کو بھیج کر طلب کیا اور حسین بغیر کسی پریشانی کے غلام کے ساتھ چلا گیا۔ حسین کے متعلق یہ باتیں رواج عام پا چکی تھیں کہ یہ شخص غائب جانتا ہے اور بہت سے پردوں کے پیچھے سے خفیہ باتیں معلوم کرتا ہے۔ حامد بن عباس تک یہ باتیں حسین کے مرید سمری کے ذریعے پہنچی تھیں۔

"غلام سمری نے کہا ہے کہ تم سحر جانتے ہو اور دلوں کا حال بتا سکتے
ہو؟ حامد بن عباس نہایت غضب ناک اپنی نشست پر پہلو بدل رہا تھا۔"۵۱

حسین بن منصور حلاج پر حامد بن عباس کی طرف سے یہ پہلا دباؤ اور غضب تھا مگر حسین نے ان باتوں کو اپنے مزاج کے خلاف اور خود سے لا متعلقہ سمجھ کر ان میں الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ حسین بن منصور حلاج کے خلاف یہ سب باتیں سچ ثابت کرنے کے لیے حامد بن عباس نے سمری کو بھی منگوا لیا تھا اور اس سے بھی حسین کے سامنے ان باتوں کا اعتراف کروایا گیا مگر بات وہی ہے کہ ہر بات کو سمجھنے والا اگر اپنی عقل کے مطابق سمجھنا شروع کر دے تو حقائق کہیں بہت دور رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح حامد بن عباس نے حسین اور حقائق سے نظریں چراتے ہوئے صرف اپنی ضد پر زور دیا اور وہ چاہتا تھا کہ حسین بن منصور حلاج ان سب باتوں کو غلط سمجھتے ہوئے اپنی غلطی کا اعتراف کر لے۔ حامد بن عباس کے نزدیک زمین کے سب فتنوں میں سے بڑا فتنہ مخلوق کا مخلوق کو سجدہ کرنا ہے۔ حسین کے نزدیک یہ وہی سجدہ ہے جس کی توفیق مخلوقِ خدا میں سے خاص لوگوں کو ہوتی ہے اور صدیوں بعد ہوتی ہے۔

"حامد اور عمار نے پھر نہایت گہری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف
دیکھا۔ اگر تم اعتراف کر لو تو رہائی ممکن ہے۔ عمار نے کہا۔"۵۲

حسین بن منصور حلاج کو جب حامد بن عباس کے سامنے پیش کیا گیا تو اس وقت حامد بن عباس کے ذہن میں اغول اور حسین کے تعلق کے بارے میں بھی خیالات چل رہے تھے مگر حامد بن عباس کے پاس ایسی کوئی وجہ نہیں بن پا رہی تھی جس کو بنیاد بنا کر وہ حسین کو قید میں رکھ سکتے۔

۳۔ حسین بن منصور حلاج کی قید

حسین بن منصور حلاج اس سجدے کی قدر جانتا تھا کہ جس سجدے کے بعد سر نہیں رہتا۔ حامد بن عباس اور دربار میں موجود لوگ حسین کی ان باتوں کو منطق کی باتیں سمجھ رہے تھے اور یہ باتیں ان کی سمجھ سے دور بھی تھیں۔ حسین جانتا تھا کہ میں جس کی قید میں ہوں اسی میں ہی رہوں گا۔ حسین کے نزدیک زندگی اسی کا نام ہے جو جس نے دی ہے اس کے لیے ہی وقف کی جائے۔ حامد بن عباس کے دربار میں حسین بن منصور حلاج کے مذہب کے بارے میں بھی سوال کیے گئے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حوالے سے بھی سوالات کیے مگر حسین کے

سب جوابات ان کو مزید الجھاتے اور غصہ دلاتے گئے اور اس طرح حسین بن منصور حلاج کو پہلی مرتبہ اپنے وفورِ شوق کے سبب قید قبول کرنی پڑی۔ منصور حلاج کی قید کے حوالے سے اعجاز الحق قدوسی اپنی کتاب ''اقبال کے محبوب صوفیہ'' میں لکھتے ہیں:

"منصور کو قتل سے پہلے جیل میں رکھا گیا وہ قید میں ایک سال رہے جیل کے
کے دروازے پر مخلوق کا ہجوم رہنے لگا جو ان سے مختلف مسائل پوچھتے تھے آخر
ملنے والوں پر پابندی لگادیگئی۔ پانچ مہینے تک ان کے پاس کوئی نہیں گیا سوائے
عطا اور عبداللہ بن خفیف کے۔"۵۳

حامد بن عباس نے حسین بن منصور حلاج کو بلا کر اس سے پھر وہی سوال دہرائے اور جوابات بھی ویسے ہی پائے۔ حامد بن عباس کو حسین سے مذہبی اور روحانی باتوں کے علاوہ اغول اور حسین کے تعلق پر بھی شدید رنج تھا۔ حامد بن عباس اس بات کو بھی جاننا چاہتا تھا کہ اغول اور حسین کا تعلق کب کا تھا اور کیسے بنا مگر ان سوالوں پر بھی حسین کے پاس ویسے ہی دلیل پر مبنی جوابات تھے۔ حسین کے مطابق تمام روحیں ازل سے ہی ایک دوسرے کو جانتی ہیں۔ حسین بن منصور حلاج کی باتوں کو سن کر حامد بن عباس مزید سیخ پا ہو رہا تھا۔

حامد بن عباس نے حسین بن منصور حلاج کو دوسری بار قید خانے میں بھجوا دیا۔ حبشی نگران نے حسین بن منصور حلاج کو قید خانے میں بند کرتے ہوئے یہ سوچا تھا کہ اب اس تاریک خانے میں بند رہنے والا حسین کبھی بھی روشن دن نہیں دیکھ پائے گا۔ حسین بن منصور نے اس حبشی کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس کا کندھا ایسے ہو گیا جیسے اس کی ہڈی ماس سے جدا ہو گئیہو۔ حبشی غلام درد سے چلانے لگا اور منصور حلاج نے دوسری مرتبہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس کا درد سرے سے غائب ہو گیا۔ حبشی غلام حسین بن منصور کی یہ برکت دیکھ کر اس کے قدموں میں گر پڑا اور وہ چاہتا تھا کہ حسین کو آزاد کر دوں مگر حسین نے یہاں کے تاریک خانے کو ایسا وسیع کر لیا کہ روشنی خود ہی اندر آنے لگی اور وہ تاریک خانہ ایک وسیع و عریض میدان کی صورت اختیار کر گیا۔ حسین تو یہاں بھی حدود کے معاملے میں آزاد تھا اور ہر جگہ کی طرح اصل کا قید تھا۔

"اور بندی خانے میں روشنی قدم قدم اترنے لگی۔ تہ خانہ روشن ہونے لگا۔
راہ دکھائی دینے لگی اور باہر دجلہ اپنی لہروں اور اپنے شفاف پانیوں سمیت

عجب سرشاری کے عالم میں بہنے لگا۔ گویا صدف کی حفاظت کے لیے مستعد
ہو رہا تھا۔ جس میں ایک دُرِ یتیم پوشیدہ تھا۔ "۵۴

حسین بن منصور حلاج کو قید میں رکھے ہوئے جب ایک طویل مدت گزر گئی اور حامد بن عباس کو اس کے خلاف کوئی ثبوت بھی نہ مل سکا تو اس نے اپنے غلام عمار کے ذریعے رہائی کا پروانہ بھیجا۔

"بہرحال یہ میری عزت کا سوال ہے۔ میں نے وزیر حامد سے تمہاری
سفارش کی تھی اور بغداد سے تمہیں کم از کم ایک سال کے لیے تو نکل جانا
چاہیے تاکہ میری بات رہ جائے اور تمہیں گزند پہنچانے کی کوئی معقول
وجہ اسے نہ مل سکے۔ "۵۵

حسین بن منصور حلاج تک جب یہ مشروط رہائی پہنچی تو اس نے اس رہائی کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ حسینجذباتِ محبت میں اس قدر مضبوط ہو چکا تھا کہ وہ ساری زمین کو اللہ تعالیٰ کی زمین سمجھتا تھا اور کسی بھی دباؤ کی وجہ سے اس ملک کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ حامد بن عباس یہ چاہتا تھا کہ حسین بن منصور حلاج بغداد کی سرزمین کو چھوڑ دے تو اسے رہائی مل سکتی ہے۔

ہ۔ حسین بن منصور حلاج کو پھانسی پر لٹکانا

حسین بن منصور حلاج نے عبادات اور ریاضت کی شدت سے گزر کر ایک ایسا مقام پالیا جس پر پہنچ کر اس نے انا الحق کا نعرہ لگادیا۔ حسین ازل سے اسی راز کی تلاش میں تھا جب اس پر تمام راز وا کردیے جائیں اور اس کی ذات اپنے خالق کی ذات کا حصہ بن جائے اور اب وہ وقت آ چکا تھا۔ اس نعرے کے بعد وہ لوگوں کے مذاق کا محور بن گیا۔

"حسین نے خروش کرتی ہوئی آواز ـــــــ ضرب لگا کر اس نے کہا: ''انا الحق
بچوں نے اس کے گرد گھیرا بنالیا۔ گڈری کو کھینچنے لگے اور انا الحق، انا الحق کا شور
مچانے لگے۔ "۵٦

حسین بن منصور حلاج کے انا الحق کے کلمے کے بعد اکثر اس کے گرد ہجوم رہتا اور کچھ لوگ سوچتے کہ یہ دیوانہ ہے اور باقی لوگ کہتے کہ بہت جلد اسے خندق میں گرادیا جائے گا اور یہ اپنے کیے کی سزا پائے گا۔ حسین بن منصور

حلاج کے نزدیک یہ کفر نہیں تھا کیونکہ خدا، خدا ہے اور میں، میں نہیں بلکہ اس کی ذات میں مدغم ہو چکا ہوں۔ کچھ وقت کے بعد کچھ لوگ اسے محض اتفاق سمجھ اس میں دلچسپی لینا چھوڑ گئے۔ حسین بن منصور اپنی حقیقت کا اعتراف یوں کرتا ہے۔

"نہیں۔ یہ کفر ہر گز نہیں ہو سکتا۔ یہ حقیقت الہیہ ہے کہ! تمہارے اور
میرے درمیان سوائے اس کے کوئی فرق نہیں کہ تم خدا ہو اور مالک الملک
(ال الہیہ وربوبیہ) وہ تم جو میں ہوں اور میں جو تم ہو۔ کوئی فرق نہیں
تمہارے ھوُ اور میرے عین میں۔ سوائے ناسوت ولاہوت کے۔"۵۷

حسین بن منصور حلاج کا یہ اعلان دوسرے صوفیا اور عالمِ دین کے لیے ایک لمحہ فکریہ کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ سب مل کر یہ بات سوچنے پر مجبور ہوئے تھے کہ آخر یہ ہمارے لیے کسی بڑی مشکل کا باعث بنے گا۔ بغداد کے بڑے بڑے عالموں جنید بغدادی سمیت سب نے یہ فیصلہ کیا جب بھی اس کے متعلق ہم سے کوئی بات پوچھی جائے گی تو ہم شرع کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ کیونکہ اس کی یہ دیوانگی صرف اس کے لیے ہی نہیں بلکہ مذہب کے لیے بھی خطرے کا باعث ہے۔ اس کی اس غلطی کی وجہ سے بہت سے سادہ لوح لوگ راہِ حق سے بھٹک سکتے ہیں۔

"عطا اور شبلی نے پوچھا" اگر طلبی ہوئی تو کیا جواب ہو گا؟"" طلبی ـــــ"
جنید جاتے ہوئے کہنے لگے "حسین کا اعلان دیوانگی ہی نہیں شریعت میں رخنہ
اندازی تھی اور خلق اس سے فساد میں مبتلا ہو سکتی تھی۔ خلق کی خاطر اسلام کے
لیے ہمیں وہی کچھ کہنا تھا جو شرع تھا۔"۵۸

وقت کے علماء اور صوفیا نے جو فیصلہ اور رائے حسین کے خلاف دی وہ ظاہر کو دیکھ کر دی گئی اور ان کی نیت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ ان کی عبادات وریاضت صرف اللہ سے حقیقی لگاؤ اور اس کی توحید کے اعتراف میں تھی ورنہ تین بار اس کے گھر کا طواف کرنے کیوں جاتے! حسین بن منصور حلاج کے انا الحق کا نعرہ لگانے کے متعلق عارف صوفیا نے یہ اعتراف کیا کہ یہ منصور حلاج کی اپنی آواز نہیں تھی بلکہ یہ مثلِ طور ہی تھی۔ منصور حلاج کے نعرہ انا الحق کے حوالے سے علامہ ترمذی کا ایک بیان ذہین شاہ تاجی اپنی کتاب میں نقل کرتے ہیں:

"وہ خود توحید کے راز سے کوئی خبر نہیں رکھتا جو منصور کو حلولی، اتحادی، ساحر کافر کہتا ہے۔" پھر یہی بزرگ فرماتے ہیں: "جس نے توحید کی بو سونگھی ہو گی وہ ان خیالات میں کب پڑ سکتا ہے مجھ کو اس شخص پر تعجب ہے جو درخت سے انیاناللہ روا جانتا ہے، اور حسین منصورؒ سے اناالحق روا نہیں جانتا، یہ کیوں نہیں جانتا، یہ کیوں نہیں سمجھا جاتا کہ جس طرح انیاناللہ کی آواز درخت سے ظاہر اور درخت درمیان میں نہ تھا، اسی طرح منصورؒ نعرہ اناالحق ظاہر ہوا اور وہ درمیان میں نہ تھا۔"۵۹

بغداد کے مقابلے میں مغرب میں فاطمی حکومت زور پکڑ چکی تھی۔ اس وقت بہت سے نئے فتنے جنم لے رہے تھے اس لیے تمام علمائے دین اور صوفیا کرام بھی محتاط تھے۔ بغداد کے صوفیا نے بھی حسین بن منصور حلاج کو مزید سمجھانے سے گریز کرتے ہوئے حکومت وقت کو شریعت کے احکام بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا تا کہ کوئی بھی نیا فتنہ دین میں سر نہ اٹھا سکے۔ ٹھیک اسی وقت حسین بن منصور کے لکھے ہوئے نقش عورتوں کے پاس دیکھے گئے اور ان میں سے ایک پارچہ حامد بن تک بھی جا پہنچا اور وہ اس پارچے میں سے حسین بن منصور کے خود کو خدا کہنے کی بو آئی۔ حامد بن عباس نے نہایت غصے میں کہا کہ یہ شخص انسان نہیں ہو سکتا اور انسان خدائی کا دعویٰ کیونکر کر سکتا ہے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ پر حامد بن عباس کو حسین بن منصور حلاج سے دوسرا عناد یہ بھی تھا کہ اغول اور حسین کا آپس میں کوئی تعلق تھا۔ اغول کے دل میں حسین کے لیے بے پناہ محبت تھی اور حسین بھی اس کو ایک آنکھ دیکھنے کے لیے تڑپتا تھا۔ حامد بن عباس کے دل میں جو بھی باتیں تھیں اب ان سب کا بدلہ وہ لے سکتا تھا کیونکہ اب وہ اپنا ذاتی غصہ بھی سامنے نہیں لائے گا اور حسین کے خدا ہونے کے متعلق جو ثبوت ملے ہیں ان کی بنیاد پر ہی وہ اس کو تختہ دار تک پہنچا دے گا۔

"بڑھیا کے پاس تھیلے میں چند خطوط تھے جو اسے ترکستان سے ابنِ منصور نے لکھے تھے۔ ان تحریروں نے یہ ثابت کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خدا سمجھتا ہے۔ دیوانہ، مخبوط الحواس! مگر یہ کیسے ـــــ اسے وہ رات یاد آرہی تھی جب اسے زبردستی قید خانے سے نکالا گیا تھا اور پھر وہ تقریباً بغداد میں کبھی دکھائی نہیں دیا"۶۰

حسین بن منصور حلاج اور اغول کا جو معاملہ تھا وہ حامد بن عباس سمیت شاید تمام دنیا والوں کی نظر میں ایک معاشقے کی حیثیت رکھتا تھا مگر حقیقت اس سے جدا تھی کیونکہ اغول عیسائی مذہب سے تعلق رکھتی تھی اور اس کے دل میں حسین کے لیے خاص مقام پیدا ہو چکا تھا۔ اغول حسین کو ابنِ مریم کے مقام پر فائز کر چکی تھی اور وہ سمجھتی تھی کہ یہ دوبارہ دنیا میں آ گئے ہیں اور اس دنیا پر پھر سے حکومت کریں گے۔ لیکن حقیقت جو بھی ہو، حسین کو حامد بن عباس کی نظر میں جن چیزوں نے مجرم بنایا تھا ان میں سے ایک قوی نکتہ حسین اور اغول کا تعلق بھی تھا۔

"وہ ابنِ منصور کو روح اللہ سمجھتی تھی۔ مسیح علیہ السلام، مہدی آخر الزماں، موعودہ نبی جو مردوں کو دوبارہ زندہ کرے گا اور وہی اب نصر حاجب کے زندان میں کئی سال سے تھا۔ اغول کا روح اللہ قید میں تھا۔"۶۱

نصر حاجب کے قید خانے میں جب منصور بند تھا تو حامد بن عباس اس کو اپنے پاس لانے کے لیے بیتاب رہتا تھا۔ نصر بھی ان سب باتوں کو لے کر پریشان رہتا تھا کہ آخر حامد بن عباس حسین میں اتنی دلچسپی کیوں لیتا ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ نصر حاجب حسین بن منصور حلاج کو ایک درویش سمجھتا تھا اس لیے بھی وہ اس کے ساتھ کسی سخت معاملے کا متحمل نہیں تھا۔ شغب بھی حسین بن منصور حلاج سے خصوصی شغف رکھتی اور سب کی نظروں سے بچ کر وہ قید خانے میں حسین کے لیے تحائف بھی بھیجتی رہتی تھی۔ شغب نے درباری معاملات میں دلچسپی لینا چھوڑ دی مگر ایک دن بڑا حوصلہ کر کے دربار میں نصر کے پاس گئی اور بہت سی باتیں کرنے کے بعد مقتدر کو نصیحت کی وہ حامد بن عباس کی باتوں میں نہ آئے وہ حسین سے جو اتنی نفرت پالے ہوئے اس کی کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔

"حامد سے محتاط رہا کرو بیٹے۔ نخوت پسند اور پر غرور شخص ہے۔"۶۲

حامد بن عباس جب مغرب سے عبید اللہ مہدی اور دیگر لوگوں سے شکست کھا کر لوٹا تو حسین بن منصور حلاج کو اس کے قید خانے میں پہنچے ہوئے ساتواں سال جا رہا تھا۔ حامد بن عباس نے حسین کو دیکھا تو اس کے دل کے پرانے زخم جاگ اٹھے کہ اس فتنہ گر کی وجہ سے اغول مجھ سے کبھی محبت نہ کر سکی اور محل کی ہر عیش و عشرت ہونے کے باوجود بھی اس نے سادہ زندگی بسر کی اور اغول کی بے رخی اور اس ساحر کی وجہ سے میں مغرب میں شکست کھا کر آیا ہوں اور اب ان سب باتوں کا ذمہ دار کون ہے؟ اور کس سے بدلہ لیا جائے۔ ان سب سوالوں نے حامد بن عباس کو ایک بار پھر بھڑکایا اور وہ حسین کو انجام تک پہنچانے کے لیے تیار ہو گیا۔

حامد بن عباس کے پاس حسین کو تختہ دار پر لٹکانے کے لیے ایک ہی وجہ تھی جو حسین کے خطوط اور نقش تھے جس میں اس نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ مگر اس دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لیے کسی عالم کے فتوے کی بھی ضرورت تھی۔ فتوے کے حصول کے لیے وہ مدرسہ نظامیہ کے شیخ جنیدؒ کے پاس حاضر ہوا اور ان کو دعوت دی کہ وہ دربار میں آئیں اور ان سے کسی کتابچے پر رائے لینی ہے۔

حضرت جنیدؒ اپنے مدرسے کے دیگر اساتذہ کے ہمراہ دربار میں حاضر ہوئے تو حامد بن عباس نے اپنے ایک ملازم کے ذریعے ایک طشت منگوایا جس میں حسین کے خطوط تھے۔ حضرت شیخ نے جب یہ خطوط پڑھے تو کسی قسم کا کوئی ردِ عمل نہیں دکھایا۔ شیخ صاحب کی یہ خاموشی دیکھ کر حامد بن بن عباس نہ رہ سکا اور بول اٹھا کہ جو خدائی کا دعویٰ کرے اس پر کیا حکم ہے:

> "کسی دیوانگی پر سند کی کیا ضرورت ہے" وزیر مملکت۔ حضرت جنید اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ "اگر دیوانگی کفر کی حدوں کو چھونے لگے تو اس پر باز پرس ضروری ہوتی ہے۔" اس نے نہایت نرمی سے کہا۔"٦٣

اس معاملے کے بعد حامد بن عباس کے حوصلہ بندھاتے ہوئے قاضی عمر نے کہا کہ حضرت آپ جنید اور اس سلسلے کے دیگر لوگوں سے کسی سچی رائے کی توقع نہ کریں کیونکہ یہ لوگ تو خود فلسفے اور الٰہیات کے نام پر توحید کو بہت پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ قاضی عمر نے حسین بن منصور حلاج کے خلاف الزامات کی ایک طویل فہرست تیار کر لیتھی۔ ان سب جرائم کی روشنی میں قاضی عمر حسین بن منصور کو معتوب کرنا چاہتے تھے۔

> "انہوں نے وہ تمام ملفوظات اور دفتر کا مطالعہ کر لیا تھا اور الزامات کی لمبی فہرست تیار کر لی تھی۔ آدمی کیا شے ہے کہ وہ خدائی کا دعویکرے۔ غیب دان ہو، مہدی موعود ہو، موسموں پر تصرف رکھتا ہو، دلوں کے حال جان لیتا ہو۔ تقدیریں بدل دینے پر قادر ہو۔ اس کی پرستش کی جاتی ہو۔"٦٤

قاضی عمر نے حسین بن منصور حلاج کے فیصلے کے لیے بغداد کے کسی بھی عالم اور صوفی کو مدعو نہیں کیا کیونکہ ان کے نزدیک وہ لوگ بھی تصوف کی دنیا میں حقیقت سے بہت دور نکل چکے ہیں۔ حامد بن عباس نے بھی اس مباحثے میں شرکت نہیں اور انھوں نے کہا کہ جو قاضی عمر فیصلہ کرے وہی فیصلہ ہو گا۔ حسین بن منصور حلاج

کے سلاخوں کے پیچھے ہوتے ہوئے تین سو قیدی جیل سے فرار ہو گئے تھے اور اس بات کا الزام بھی حسین پر ہی تھا کہ انھوں نے دیواروں کو اپنی اصل جگہ سے پرے ہٹا دیا تھا اور وہ لوگ اس وجہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے تھے۔

حسین کو عدالت میں پیش کیا گیا اور تمام الزامات اور ان کے گواہین کو پیش کیا گیا اور قاضی ابوالحسین اور البہلول نے بھی یہی کہا کہ یہ شخص قابلِ گردن زدنی ہے۔ قاضی عمر کیونکہ اس کے معاملے میں زبانی فیصلہ تو دے چکے تھے بس لکھنا باقی تھا۔ قاضی عمر عدالت میں بیٹھے کچھ دیر حسین کی باتوں کو سوچتے رہے کہ وہ خود کو سنت اور شریعت کے مطابق سمجھتا ہے تو کیوں نا اس کے خون کا دفاع کیا جائے مگر سب کے دباؤ اور اپنی کہی ہوئی بات کو لکھنے پر مجبور پا کر حسین کے لیے آخری مہر ثبت کرتے ہیں۔

> "سر جھٹک کر، کوئی راہِ فرار نہ پا کر ابو عمر نے اس کاغذ پر اپنی مہر ثبت کر دی اور فتویٰ لکھ دیا۔ اور پھر لوگوں نے قضاۃ نے اور شحنہ نے اور خود ابوالحسین آشنائی نے اپنی اپنی مہریں لگائیں اور نام لکھے اور حسین ابن منصور کی موت کے پروانے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔"٦٥

دجلہ کے کنارے اسیر انا الحق کہنے والے حسین بن منصور حلاج کو تختہ دار پر لٹکا دیا جائے اور ہر طرف یہی شور اور فضاؤں پر عجیب سا سکوت طاری ہو چکا تھا۔ حسین بن منصور حلاج پر فتویٰ دینے والے علماء اور صوفیا کو مولانا روم نے علمائے رسوم قرار دیا ہے۔ یہ صوفیا قلم کے غدار ہیں اور عارف ہوتے ہوئے بھی غیر عارف ہیں۔ کیونکہ یہ صوفیا صرف ظاہر کے معاملات دیکھ کر حسین بن منصور حلاج کے خلاف فتوی دے چکے تھے۔ اس حوالے سے بابا ذہین شاہ تاجینے مولانا روم کا ایک بیان نقل کیا ہے:

> "پس بجا طور پر مولانا رومؒ نے اس کو غدار کہا ہے جس نے منصور کے محضرِ قتل پر دستخط کیے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس غدار سے مراد ایک فرد واحد ہے چوُں قلم در دستِغدارے بود''، اور یہ غدار صرف وہی شخص ہے جو اپنے قلم سے غدر کرتا ہے، جانتے ہوئے انجان بنتا ہے، عارف ہو کر غیر عارف بنتا ہے۔"٥٧-٦

حسین بن منصور حلاج پر فتویٰ دینے والے علماء اور صوفیا کو مولانا روم نے علمائے رسوم قرار دیا ہے۔ یہ صوفیا قلم کے غدار ہیں اور عارف ہوتے ہوئے بھی غیر عارف ہیں۔ کیونکہ یہ صوفیا صرف ظاہر کے معاملات دیکھ کر حسین بن منصور حلاج کے خلاف فتویٰ دے چکے تھے۔

حوالہ جات:

۱۔ حمیرا اطہر، جمیلہ ہاشمی سے ملاقات، اخبار خواتین (ہفت روزہ)، کراچی، ۷ تا ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۷ء، ص ۲۰
۲۔ محمد اسلم، جمیلہ ہاشمی کا افسانوی ادب (مقالہ برائے ایم فل)، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء، ص ۲۴۷
۳۔ ایضاً ص ۲۴۸
۴۔ سید ذوالقرنین عسکری، جمیلہ ہاشمی بحیثیت ناول (مقالہ برائے ایم فل)، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، ۱۹۸۸ء ص ۳۰
۵۔ محمد خالد اختر، آتش رفتہ، ماہِ نو (مجلہ)، لاہور، اکتوبر ۱۹۸۸ء، ص ۱۸
۶۔ حمیرا اطہر، جمیلہ ہاشمی سے ملاقات، اخبار خواتین (ہفت روزہ)، کراچی، ۷ تا ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۷ء، ص ۲۰
۷۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء ص ۲۳
۸۔ ایضاً ص ۲۶
۹۔ ایضاً ص ۲۴
۱۰۔ ایضاً ص
۱۱۔ ایضاً ص ۴۸
۱۲۔ ایضاً ص ۵۹
۱۳۔ ایضاً ص ۶۰
۱۴۔ ایضاً ص ۶۱
۱۵۔ ایضاً ص ۶۲
۱۶۔ مفتی غلام معین الدین نعیمی (مترجم)، کشف المحجوب، بابا پبلشرز اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۴، ص ۲۵۴
۱۷۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء ص ۷۲
۱۸۔ ایضاً ص ۷۴۔۷۵
۱۹۔ ایضاً ص ۷۴

۲۰۔ ایضاً ص ۲۲۰

۲۱۔ ایضاً ص ۷۷

۲۲۔ ایضاً ص ۲۲۰

۲۳۔ ایضاً ص ۷۸

۲۴۔ ایضاً ۲۱

۲۵۔ ایضاً ص ۷۹

۲۶۔ ایضاً ص ۸۱

۲۷۔ ایضاً ص ۲۲۱

۲۸۔ ایضاً ص ۸۵

۲۹۔ بابا ذہین شاہ تاجی، کتاب الطواسین لامنصور الحلاج، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۵، ص ۷

۳۰۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس، سنگِ میل پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء ص ۸۶

۳۱۔ ایضاً ص ۸۹

۳۲۔ ایضاً ص ۱۱۳

۳۳۔ ایضاً ص ۱۰۹

۳۴۔ ایضاً ص ۱۴۴

۳۵۔ ایضاً ص ۱۵۱

۳۶۔ ایضاً ص ۱۷۲

۳۷۔ ایضاً ص ۱۷۳

۳۸۔ حضرت شیخ فرید الدین عطار، تصیح (مولانا اختر حجازی)، تذکرۃ الاولیاء، آر آر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۸ء ص ۲۳۰

۳۹۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس، سنگِ میل پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء ص ۱۷۵

۴۰۔ ایضاً ص ۱۷۵

۴۱۔ ایضاً ص ۱۷۶

۴۲۔ ایضاً ص ۱۸۱

۴۳۔ ایضاً ص ۱۸۳

۴۴۔ باباذہین شاہ تاجی، کتابالطواسین لا منصور الحلاج، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۵، ص ۸

۴۵۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس، سنگِ میل پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء ص ۱۸۹

۴۶۔ ایضاً ص ۱۹۱

۴۷۔ ایضاً ص ۲۰۹

۴۸۔ ایضاً ص ۲۱۰

۴۹۔ ایضاً ص ۲۱۷

۵۰۔ ایضاً ص ۳۲۴

۵۱۔ ایضاً ص ۳۲۹

۵۲۔ ایضاً ص ۳۳۱

۵۳۔ اعجاز الحق قدوسی، اقبال کے محبوب صوفیہ، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۷۶ء ص ۴۱

۵۴۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس، سنگِ میل پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء ص ص ۳۳۹

۵۵۔ ایضاً ص ۳۴۵

۵۶۔ ایضاً ص ۳۶۴

۵۷۔ ایضاً ص ۳۶۶

۵۸۔ ایضاً ص ۳۶۴

۵۹۔ ایضاً ص ۳۹۴

۶۰۔ باباذہین شاہ تاجی، کتابالطواسین لا منصور الحلاج، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۵، ص ۹

۶۱۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس، سنگِ میل پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء ص ۴۰۵

۶۲۔ ایضاً ص ۴۱۷

۶۳۔ ایضاً ص ۴۲۷

۶۴۔ ایضاً ص ۴۵۶

۶۵۔ ایضاً ص ۴۷۲

۶۶۔ باباذہین شاہ تاجی، کتابالطواسین لامنصور الحلاج، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۵، ص ۱۱۔ ۱۲

باب چہارم: ایلف شفق اور جمیلہ ہاشمی کے مجوزہ ناولوں کا تقابلی جائزہ
(تصوف کے حوالے سے)

الف۔ چالیس چراغ عشق کے اور دشتِ سوس میں موجود اشتراکات (تصوف کے حوالے سے)

ا۔ تصوف اور حقیقت کے راز۔

"چالیس چراغ عشق کے" اور "دشتِ سوس" میں تصوف کو مختلف کرداروں کی مدد سے پیش کیا گیا ہے۔ ان ناولوں میں دو ایسے کردار دپیش کیے گئے ہیں جو علم حقیقت کے رازوں کی تلاش میں سر گرداں ہوتے ہیں اور علم کے ابتدائی مراحل سے ہی دوسروں سے کچھ زیادہ متجسس نظر آتے ہیں اور ایسے رازوں کے متلاشی بن جاتے ہیں جن تک رسائی ہر کسی کی نہیں ہو سکتی۔ رومی دینی اور دنیاوی علم کے ماہر تھے اور اپنے علاقے میں ایک نام رکھتے تھے مگر حقیقت کی دنیا کے راز پانے میں تب ہی دلچسپی پیدا ہوئی جب شمس تبریز سے ملاقات ہوئی۔ اور پھر یہ دلچسپی اس قدر بڑھ گئی کہ خدا تعالیٰ سے دعا کرنے لگے کہ میرا سینہ کھول دے تاکہ میں وہ راز جان سکوں جن کا میں متلاشی ہوں۔ رومی کی دعا کے حوالے سے "چالیس چراغ عشق کے" میں ایلف شفق لکھتی ہیں:

> "بطن اللہ۔۔۔ خدا کا مخفی چہرہ۔ میرے قلب کو کھول دیجیے تاکہ میں حق دیکھ سکوں۔" جب شمس تبریز نے پیغمبر محمد ﷺ اور صوفی بسطامی کے بارے میں سوال پوچھا، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے روئے زمین پر ہم دو لوگ ہی باقی رہ گئے تھے۔ ہمارے سامنے راہِ حق کے سات مراحل کھلے تھے۔۔۔ سات مقامات جن پر سے ہر نفس کو معرفتِ حق اور یکتائی کے حصول کے لیے گزرنا پڑتا ہے۔"[1]

یہ راہِ حق کے مراحل جن کو طلب کرنا آسان تھا اور ان مراحل سے گزر کر خدا کے قرب کو پہنچنا بڑا مشکل کام تھا۔ اس مرحلے تک رسائی کے لیے اپنے نفس کو کٹھن سے کٹھن مرحلے سے گزارنا پڑتا ہے۔

"دشت سوس" میں حسین بن منصور حلاج کا بھی یہی حال ہے کہ وہ اپنی ذات کو خدا کی ذات میں مدغم کرنے اور حقیقت کے راز پانے کے لیے بیتاب نظر آتا ہے۔ حسین بھی عبادت و ریاضت میں مگن رہتا ہے اور خدا کی ذات کو راضی کر کے حقیقت کے سراغ لگانے کے لیے پل پل تڑپتا ہے۔ حسین چاہتا کہ اس کا سینہ بھی اس قدر

فراخ ہو جائے کہ وہ ان رازوں تک رسائی حاصل کرلے جن تک عام آنکھ اور دنیادار انسان نہیں پہنچ سکتا۔ حسین کو سہل عبداللہ تستری کے مدرسے میں بھی دوسروں سے آگے بڑھ جانے اور حقیقت کے راز پالینے کی تڑپ رہتی تھی۔ حسین بن منصور حلاج نے اس مقصد کے حصول کے لیے اپنے شیخ کی ناراضی مول لے کر ان کے رسائل کا مطالعہ کیا تھا۔ ان رسائل سے حسین پر وہ راز افشاں ہوئے جو اس کی عمر اور طلب سے کہیں زیادہ تھے مگر وہ تو طالب بھی زیادہ کا ہی تھا۔ حسین کی دعا کے حوالے سے جمیلہ ہاشمی "دشتِ سوس" میں یوں رقمطراز ہیں:

"حسین نے جنگل میں اپنی عبادت گاہ میں ایک کونے میں سجدہ ریز ہو کر کہا:
میرے پروردگار! میں اکیلا ہوں اے میرے مالک میں اکیلا ہوں۔ مجھے وہ عطا ہو
جس سے وحشتِ تنہائی دور ہو۔ مجھے اپنی محبت کی آتشِسوزاں میں پگھلنے کا حوصلہ
تو دے۔ ہاں میرے خالق، مجھے انعام دے کہ میں اکیلا ہوں۔"۲

حقیقت کے راز پانے کے لیے مولانا روم اور حسین بن منصور حلاج اپنی عبادات میں ہمیشہ محو و مگن نظر آتے ہیں۔ جہاں دنیا کے کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے وہیں حقیقت کے راز پانے کے لیے انسان کو پنی ذات کو خدا کی ذات میں مدغم کرنے کے لیے حد سے زیادہ عبادت و ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے مطلبتزکیہ نفس کی ضرورت ہوتی ہے۔ حسین بن منصور حلاج بچپن سے ہی شب بھر جاگ کر طویل عبادات کرنے کا عادی تھا۔ اکثر حسین اپنی عبادات میں اس قدر محو و مگن رہتا کہ کھانا پینا اور سونا تک بھول جاتا۔ حسین بن منصور حلاج کی عبادات کے حوالے سے بابا ذہین شاہ تاجی لکھتے ہیں:

"منصور جہاں علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے، وہاں زہد و ریاضت اور
عبادت و طاعت میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ کتاب و سنت کی پیروری
اپنے آپ پر لازم جانتے تھے، کم از کم ایک ہزار رکعت، روزانہ نماز ادا کرتے
تھے اور فرماتے تھے کہ یہ ایک ہزار رکعت میں اپنے آپ پر فرض سمجھتا ہوں۔"۳

حسین بن منصور حلاج اپنی عبادات کے ذریعے خدا تعالیٰ کی ذات کی رضاحاصلکرنا اور کچھ حقیقت کے ایسے راز حاصل کرنا چاہتے تھے جن کی مدد سے وہ دوسرے انسانوں سے زیادہ اللہ کے قریب ہو جائیں اور حقیقت کے قریب ہو جائیں۔ حسین بن منصور حلاج نے سہل عبداللہ تستری کے مدرسے میں ان کے رسائل کے ذریعے

جن اسماءِ اعظم کا مطالعہ کیا تھا ان اسماء نے حسین کو اپنے مقصد میں پہلے سے بھی زیادہ متجسس کر دیا تھا۔ ان عبادات اور شوق کے مراحل کے بعد ایک مقام ایسا ضرور آتا ہے جہاں اس انسان کا ظاہر و باطن ایک ہو جاتا ہے اور مطلوبہ حقیقت کے راز پا لیتا ہے۔ اس حوالے سے مسز فاطمہ برہان قادری سروری لکھتی ہیں:

"انسانِ کامل کو بارگاہِ الٰہی سے رب الارباب کا لقب حاصل ہے۔ اس لیے اس کا ظاہر و باطن ایک ہوتا ہے۔ اس کے باطن میں موجود ذاتِ حق تعالیٰ کامل طور پر اس میں ظاہر بھی ہے۔ اس کا باطن ربوبیت کا نام ہے اور ظاہر عبودیت کا۔"۴

مولانا روم نے جب شمس تبریز سے ملاقات کی تو ان کے پہلے ہی سوال نے مولانا روم کے دل میں الاؤ جلا دیا جس کے بعد مولانا روم کا آرام سے بیٹھنا مشکل تھا اور ہر وقت شمس تبریز کے ساتھ مل کر حقیقت کے رازوں کے متعلق باتیں کرتے رہتے اور اس محفل میں مولانا روم کے گھر کے کسی فرد کو بھی مخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ مولانا روم اپنے مطالعے کو شمس تبریز کے سامنے ہیچ اور ناقص سمجھتے تھے اور وہ راز جان لینا چاہتے تھے جن کی مدد سے وہ خدا تعالیٰ کی ذات کا قرب اور حقیقت کے وہ راز جان لیں جن سے عام انسانوں میں سے ارفعیت کے درجے تک رسائی ہو سکتی ہے۔ حقیقت کے رازوں کو پانے کے لیے مولانا روم ہر وقت خدا کی عبادات میں لگے رہتے تھے۔ مولانا روم کو شمس تبریز خدا کی محبت کے حصول کے حوالے سے نصیحت کرتے ہیں کہ یہ انسان کی اپنی لگن اور شوق پر منحصر ہے۔

"آپ جانتے ہیں کہ خدا کی محبت ایک بحرِ بے کنار ہے اور انسان جتنا پانی اس سے لے سکتے ہیں، لینے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ لیکن انجام کار ہم سے ہر کوئی جتنا پانی لے سکتا ہے، وہ ہمارے پیالے پر منحصر ہے۔ کچھ لوگوں کے پاس بڑا برتن ہوتا ہے جب کہ کچھ کے پاس ڈول جب کہ کچھ ایسے ہیں جن کے پاس صرف پیالے ہوتے ہیں۔"۵

اُدھر حسین بن منصور حلاج بھی خدا کی عبادت میں اس لیے ہر وقت کھوئے رہتے ہیں کہ وہ خدا کی محبت کے کے بحرِ بے کراں سے زیادہ سے زیادہ حاصل کر سکیں۔ دونوں ناولوں کے صوفیا میں یہ قدر مشترک ہے کہ وہ

عبادات میں حد سے زیادہ مگن رہتے ہیں اور اسی کے ذریعے وہ راز پالینا چاہتے ہیں جو عام انسان کے بس کی بات نہیں۔

۲۔ تصوف اور انسانیت سے محبت:

محبت خدا سے خدا کی مخلوق کے ذریعے کرنا صوفیا کو زیادہ پسند ہے اور اس محبت پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ دنیا دار اور دین کو صرف بظاہر پڑھنے والے براہ راست خدا کی محبت چاہتے ہیں مگر ایک صوفی خدا کی محبت خدا کی مخلوق سے بغیر کسی تفریق کے چاہتا ہے۔ صوفی کے نزدیک خدا کی ساری مخلوق قابلِ محبت اور قابلِ رحم ہے۔ اگر نوعِ انسان میں سے کوئی انسان بھٹک بھی گیا ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ مکمل طور پر ہی بھٹک گیا ہو مطلب اس کا ظاہر اور باطن ایک جیسا ہو گیا ہو۔ صوفیا کی محبت مذہبی، لسانی، علاقائی اور گروہی تقسیم سے بالاتر ہو کر تمام انسانوں سے ایک جیسی ہوتی ہے۔ شمس تبریز نے مولانا روم کو ایک طوائف، شرابی اور بھکاری سے محبت کر کے اس بات کا درس دیا کہ یہ لوگ دنیا کی نظر میں برے ہو سکتے ہیں مگر ان کے باطن میں اپنے خالق کی محبت شاید دوسروں سے بہتر ہو۔ صوفی بغیر کسی سبب اور انجام کے محبت کرتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک لمحہ موجود ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اس کی دوسری مثال یہ ہے تمام صوفیا نے خدا سے صرف اس لیے محبت کی کہ بس وہ اس سے محبت کرتے تھے اور اس کا قرب حاصل کرنا چاہتے تھے۔ صوفیا محبت کرتے وقت جنت اور جہنم کا تصور ذہن میں نہیں رکھتے بلکہ صرف اور صرف خدا کا قرب اور اس کی مخلوق کی خوشی مقصود ہوتی ہے۔ خدا سے محبت خدا کے قرب کے لیے اور اس کی مخلوق سے محبت خدا کے لیے ہو تو پھر اس مخلوق کی بیرونی شباہت اور دنیا کی دیکھنے والی آنکھ صوفی کو متاثر نہیں کرتی۔ ایک صوفی کی محبت کے حوالے سے ایلف شفق ''چالیس چراغ عشق کے'' میں لکھتی ہیں:

> "محبت ہی سبب ہے۔ محبت ہی منزل ہے۔ اور جب آپ خدا سے اس قدر محبت
> کرتے ہیں، جب آپ اُس کی ہر تخلیق سے اُسی کی وجہ سے اور اس کی بدولت محبت
> کرتے ہیں تو بیرونی عناصر ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اس مقام سے آگے مزید کوئی
> ''میں'' نہیں ہو سکتی۔ آپ صرف صفر ہو کر رہ جاتے ہیں، اتنا بڑا صفر کہ جو
> آپ کے پورے وجود کو ڈھاپ لیتا ہے۔"٦

حسین بن منصور حلاج بھی محبت کے بارے میں ایسے ہی تاثرات رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک محبت ہر مادی اور غیر مادی شے میں موجود ہوتی ہے اور یہی محبت ہے جس کے باعث کائنات کی ہر شے کی اہمیت ہے اور کائنات کا یہ نظام چل رہا ہے۔ خدا نے اپنی مخلوق سے محبت کی اور مخلوق کو بھی محبت سکھائی اور مخلوق میں سے جو لوگ نفس کے مراحل طے کرنے کے بعد صوفیا کے درجے تک پہنچ جاتے ہیں ان کے نزدیک دنیادار بننے کی مشقت مضحکہ خیز ہے۔ محبت ایک ایسے طاقتور جنگجو کی مانند ہے جو ساری دنیا فتح کرلے اور پھر اپنا راج چلائے اور محبت کے بغیر دنیا ایک قدم میں سکڑ کر رہ جاتی ہے۔ جب دنیا ایک قدم میں سکڑ کر رہ جائے گی تو اس ایک قدم پر رہنے والا انسان خود غرض اور مطلب پہو کر رہ جائے گا اور حتی المقدور باقی دنیا سے غافل ہو جائے گا۔ حسین بن منصور حلاج نے انسانیت سے محبت کو کائنات کا جزولازم قرار دیا ہے۔ حسین بن منصور حلاج بھی شمس تبریز اور مولانا روم کی طرح بغیر کسی تفریق کے محبت کے حق میں ہیں۔ حتیٰ کے اغول ایک غیر مسلم اور پھر حسین کا دادا اور دادا کے بہت سے دوست اسلام سے دور تھے مگر انہوں نے سب کے ساتھ محبت بغیر کسی تفریق کے جاری رکھی۔ حسین بن منصور حلاج کا محبت کے بارے میں جو یقین تھا اس حوالے سے جمیلہ ہاشمی ''دشتِ سوس'' میں بیان کرتی ہیں:

"محبت کا کبھی نہ ختم ہونے والا نغمہ جو عرش فرش اور ارد گرد ایستادہ لوگوں
کے دلوں پر مادی اور غیر مادی شے میں جاری وساری تھا۔ محبت جو فاتح عالم ہے
اور دنیا جو بس ایک قدم ہے۔ ایکجسٹ، دنیادار بننے کی مشقت کتنی مضحکہ خیز ہے۔"ے

ایک صوفی مخلوقِ خدا سے صرف اس لیے محبت کرتا ہے کہ وہ اس کے ذریعے خدا تعالیٰ کی خوشنودی چاہتا ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ خدا اپنی مخلوق کے دل میں رہتا ہے۔ مخلوقِ خدا خوش ہو جائے تو خدا بھی اپنے بندے پر خوش ہو جائے گا۔ عام انسان مخلوق خدا سے اس کی ظاہری حالت دیکھ کر محبت کرتا ہے مگر صوفی مخلوق کے دل میں بسنے والے خدا کو دیکھ کر ان سے محبت کرتا ہے۔ یہی حال مجوزہ ناولوں میں بیان کردہ صوفیا کا ہے جو مخلوقِ خدا سے ان کے ظاہری عیبوں کو بھول کر محبت کرتے ہیں۔ ''چالیس چراغ عشق کے'' میں شمس تبریز نے ایک طوائف گلِ صحرا سے لگاؤ رکھا اور پھر دوسروں کی نفرت سے بچا کر اسے مولانا روم کے گھر میں رکھا، جہاں دیکھنے والے سب لوگ ان سے نفرت کرتے تھے مگر شمس تبریز نے ان کے دل کا احوال جان کر ان کو عزت والا ایک مقام دیا۔ بالکل اسی طرح حسین بن منصور حلاج بھی ایک عیسائی عورت سے محبت کرتے ہیں جن کو بظاہر دوسرے

مسلمان اس لیے ناپسند کر سکتے ہیں وہ عیسائی ہے اور بکنے کے لیے آئی ہے۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر جب وہ مریمؑ کی باتیں کرتی ہے تب بھی حسین اس کو مقام دیتے ہیں اور اس کی ویسی ہی عزت کرتے ہیں کیونکہ حسین ایک صوفی ہیں اور وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اس کے دل میں خدا کی محبت موجود ہے۔ شمس تبریز اس حوالے سے کہتے ہیں:

"تمہارا کیا خیال ہے، خدا مکہ میں رہتا ہے یا مدینہ میں؟ یا پھر کہیں کسی مقامی مسجد میں؟ لوگ کس طرح یہ تصور کر سکتے ہیں کہ خدا کسی محدود جگہ میں مقیم ہو سکتا ہے جب کہ وہ خود کھل کر فرماتا ہے، میں آسمانوں میں اور زمین میں نہیں سما پاتا مگر اپنے بندے کے دل میں سما جاتا ہوں۔" ۸

حسین بن منصور حلاج کا بھی یہی دعویٰ تھا کہ خدا اپنی مخلوق کے دلوں میں رہتا ہے۔ خدا تعالی سے محبت کے لیے اس کی مخلوق سے محبت از حد ضروری ہے۔ حسین بن منصور حلاج اگر کسی کے ساتھ سفر کرتے ہوئے اس کے ساتھ بھلائی کرتے ہیں، ہمدردی کرتے ہیں یا اس کے لیے دعا کرتے ہیں تو اس کا ایک ہی مقصد ہوتا تھا کہ وہ اس انسان کی خوشی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جیسے شمس تبریز ایک طوائف، گداگر اور شرابی کے ساتھ ہمدردی کرتے ہیں بالکل اسی طرح حسین بن منصور حلاج بھی ایک نسطوری قافلے کو غیر مسلم مانتے ہوئے بھی ان کے ساتھ بھلائی کرتا ہے کہ وہ خدا کی مخلوق ہیں اور اس مخلوق کی بھلائی کے ذریعے خدا اس پر بھی راضی ہو جائے گا۔

۳۔ تصوف اور عشق:

عشق کو بظاہر دو جسموں کے درمیان حد سے بڑی محبت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے مگر صوفیا کے نزدیک عشق ایک زینہ ہے جس کے ذریعے وہ خود کو اور دوسرے انسانوں کو اصل منزل کا نشان دکھاتے ہیں۔ صوفیا کا عشق جسمانی حدود اور مطالب سے ماورا ہوتا ہے وہ کسی مادی فائدے کے لیے یہ عشق نہیں کرتے بلکہ ان کے عشق کا تصور اور مقصد صرف اور صرف انسان اور خدا کی محبت کو مضبوط کرنا ہوتا ہے۔ ایک صوفی اس عشق کے ذریعے یہ بات بھی ثابت کرتا ہے کہ عشق کے بغیر زندگی کس قدر بے کیف اور بے رنگ ہوتی ہے۔ یہ عشق ہی جو زندگی کو حقیقی لطف سے آشنا اور سات رنگوں کا پیکر بناتا ہے۔ ایک صوفی سمجھتا ہے جس طرح میں اپنے

خالق سے عشق کرتا ہوں اسی طرح یہ دیگر لوگ بھی عشق کی گہرائی اور تڑپ سے آگاہ ہو جائیں۔'' چالیس چراغ عشق کے'' اور ''دشتِ سوس'' میں عشقیہ واقعات سامنے آئے ہیں جیسا کہ ایلا کا اے عزیز ظہارا سے عشق اور حسین بن منصور حلاج کا اغول کا ساتھ عشق۔ یہ دونوں صوفی جب عشق کرتے ہیں تو ان کے محبوب کی روحوں میں بھی تڑپ نمایا ہوتی ہے۔ صوفیا کا عشق مجازی کے عشق کے بر عکس روحانی عشق ہوتا ہے کیونکہ یہ جسم سے اگلے درجے پر مطلب روح سے عشق کرتے ہیں۔

ایلا اور اے عزیز ظہارا کے عشق کی بات ہو، رومی اور شمس تبریز کے عشق کی بات ہو یا پھر حسین بن منصور حلاج یا اغول کے عشق کی بات ہو۔ یہاں پر ہمیں مادی عشق کے بر عکس محبوب بھی اپنے عاشق کی طرف اسی شدت سے بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں جس شدت سے عاشق اپنے محبوب کی طلب کرتا ہے۔ رومی اپنے محبوب شمس تبریز کو خواب میں دیکھتے ہیں اور ان سے ملنے کے لیے ہر پل تڑپتے ہیں اور دوسری طرف ان کا محبوب بھی اپنے عاشق سے ملنے کے لیے دعائیں مانگ رہا ہے۔ مادی اور روحانی عشق میں پہلا فرق جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے محبوب اپنے عاشق کے لیے عاشق سے بھی زیادہ بیتاب ہوتا ہے۔ دونوں ناولوں کے صوفیا میں عشق کی تڑپ کی قدر مشترک ہے اور اس میں دوسری بات بھی مشترک ہے کہ محبوب اپنے عاشق کے لیے اسی شدت سے تڑپتا ہے جس شدت سے عاشق تڑپتا ہے۔ ایلا اے عزیز ظہارا کا ناول پڑھ کر اس پر فدا ہو جاتی ہے اور دوسری طرف اے عزیز ظہارا بھی ایلا کی میل پڑھ کر اس سے ملنے کا متمنی ہو جاتا ہے۔ اے عزیز ظہارا بہت دور ایلا سے ملنے بوسٹن چلا آتا ہے۔

> "عزیز نے کہا، جب لوگ غیر معمولی اور غیر متوقع حالات کے لیے تیار
> ہو جائیں تو بے لگام خوابوں سے بھی آگے عجیب واقعات رونما ہوتے ہیں
> لیکن ایلا اس سب کے لیے ذرہ برابر تیار نہ تھی جو ہوا: اے عزیز ظہارا اس
> سے ملنے بوسٹن چلا آیا۔"٩

حسین اور اغول کا عشق بھی بظاہر ایک مادی عشق نظر آتا ہے مگر حسین اغول کے جسم سے بے پرواہ اور اغول حسین کے لمس سے لاتعلق نظر آتی ہے مگر یہی عشق، عشقِ حقیقی کی لو دیتا ہے۔ اغول نے حسین کو اور حسین

نے اغول کو پہچان لیا تھا۔ ان دونوں کی روحیں عشقِ حقیقی سے منور نظر آتی ہیں۔ حسین کے عشق کے حوالے سے جمیلہ ہاشمی لکھتی ہیں:

"آتش پرستی اس کے خون میں رچی بسی تھی اور یہ آگ وہ نہیں تھی جس کو ہم دیکھتے تھے بلکہ یہ وہ آگ تھی جس کے اندر آتش و آب و خاک و باد اور یہ حرارت، حرارِ تعشق تھی اور اس کی حرکت سے لو نکلتی تھی اور وہ عشقِ حقیقی کی لو تھی۔"۱۰

یہ وہ عشق ہے کچھ لوگ اِسے وراثت سے جوڑتے اور کچھ لوگ اس کو مادی عشق کا نام دیتے ہیں مگر ایک صوفی کا عشق مادی نہیں بلکہ روحانی ہوتا ہے جس عشق کا اصل تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتا ہے۔

۴۔ تصوف اور روحانی طاقت:

"چالیس چراغ عشق کے" اور د"شتِ سوس" کے صوفیا کو کچھ ایسی روحانی کرامات عنایت ہوئی ہیں جنہیں دیکھنے والے ساحرانہ باتیں کہتے ہیں مگر یہ سب ان کی عبادت و ریاضت کے سبب قرب ربانی کے طفیل ہوا ہے۔ شمس تبریز اور حسین بن منصور حلاج عوام کے بارے میں ان کے دل کی کچھ ایسی باتیں بتاتے ہیں جن پر وہ لوگ حیران ہوتے ہیں ان صوفیا کو جادو گر قرار دیتے ہیں۔ شمس تبریز جب بابا زمان سے بند کمرے میں باتیں کرتے ہیں تو شمس تبریز کا مرید ان کی باتیں خفیہ طریقے سے سننے کی کوشش کرتا ہے اور شمس تبریز بند کمرے میں سے اسے دیکھ لیے ہیں۔

حامد بن عباس کا غلام عمار، جب حسین کو حامد بن عباس کے سامنے لے کر جاتا ہے تو وہ بھی حسین پر یہی الزام عائد کرتے ہیں کہ یہ ساحری ہے اور بہت سے راز جانتا ہے۔ حامد بن عباس نے جب حسین بن منصور حلاج کو تاریک خانے بند کرنے کے لیے اپنے حبشی غلام کو دے کر بھیجا تو حبشی غلام نے حسین کو کندھے سے پکڑا تو اُسے اپنے کندھے میں اتنا درد ہوا کہ یوں لگا جیسے اس کے کندھے کی ہڈی اور ماس الگ الگ ہو گئے ہیں۔ اسی درد زدہ کندھے پر جب حسین نے ہاتھ رکھا تو اس کا کندھا بالکل ٹھیک ہو گیا اور یوں لگا جیسے اس میں کبھی درد تھا ہی نہیں۔ حبشی غلام نے دیکھا کہ تاریک خانہ روشن ہو چکا ہے اور اس بندی خانے کی دیواریں نظر کی حد تک وسیع ہو چکیہیں۔ یہ سب کرامات دیکھ کر حبشی غلام حیران ہو کر حسین کے قدموں میں گر پڑا۔ حسین بن منصور پر ایسے ہی الزام بھی

لگائے گئے کہ یہ غائب جانتا ہے، دلوں کی باتوں کو بیان کر دیتا ہے۔ حسین بن منصور کی روحانی طاقتوں کے حوالے حامد بن عباس نے جو باتیں کی تھیں ان باتوں کو جمیلہ ہاشمی بیان کرتی ہیں:

"آدمی کیا شے ہے کہ خدائی کا دعویکرے، غیب دان ہو، مہدی موعود ہو
موسموں پر تصرف رکھتا ہو۔ دلوں کے حال جان لیتا ہو، تقدیریں بدل دینے
پر قادر ہو۔ اس کی پرستش کی جاتی ہو۔"۱۱

۵۔ تصوف اور صوفیا کا قتل:

تصوف اپنی ذات کو تج دینے کا نام ہے مطلب ہر کام اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے۔ جب ایک صوفی اپنے ہر اعمال کی بنیاد اللہ کی رضا پر رکھتا ہے تو وہ اپنے اعمال کے دنیاوی نتائج کو بھول جاتا ہے۔ لوگ اس کے بارے میں کیا سوچیں گے اور اس کے ان اعمال پر کس طرح کا رویہ اختیار کریں گے۔ صوفیا کو اپنے اعمال کی وجہ سے بعض اوقات دنیا دار جان سے بھی محروم کر دیتے ہیں۔ دنیاداروں یا شریعت پسندوں کے نزدیک صوفیا کے اعمال اور دعوے کفریہ ہوتے ہیں اور ان کی عبادات بدعت کو چھوتی ہیں۔

"چالیس چراغ عشق کے" میں شمس تبریز کے اعمال کی وجہ سے بھی بہت سے دین دار اور دنیادار ان سے نفرت کرنے لگے تھے اور ان کے اعمال کو کفر سمجھنے لگے تھے۔ شمس تبریز کے حوالے سے دنیاوالوں کا یہ نظریہ تھا کہ ہر کسی انسان کو پاک اور قابلِ رحم سمجھتا ہے۔ شمس تبریز طوائف، شرابی اور گداگر سب کے لیے الفت و محبت کے بازو پھیلائے رکھتا ہے اور یہ درویش کیسا ہے جو مذہب کی حدود و قیود کا خیال نہیں رکھتا۔ شمس تبریز نے جب ایک طوائف کو مولانا روم کے گھر میں جگہ دی تو مولانا کے بیٹے سمیت بہت سے لوگ ان کے مخالف ہو گئے۔ شمس تبریز نے جب مولانا روم کو شراب لانے کے لیے بھیجا تو مولانا روم کے مرید شمس تبریز کے خلاف ہو گئے اور ایک دن جب شمس تبریز نے مولانا روم کے گھر میں رقص اور موسیقی کا اہتمام کیا تو امراء بھی شمس تبریز کے خلاف ہو گئے۔ یہ نفرتیں شمس تبریز کے قتل کا سبب بنیں۔ شمس تبریز کیونکہ ایک صوفی تھے اس لیے ان کا ہر کام رب تعالیٰ کی رضا کے لیے اور انسانیت کی محبت میں تھا مگر دنیا دار اور شریعت کی آنکھ سے دیکھنے والے شمس تبریز کے باطن کو نہ دیکھ سکے اور آخر کار اس عناد کا بدلہ شمس تبریز کے قتل کی صورت میں لیا۔

"ہم نے اس کی لاش اٹھائی جو عجیب طور پر بے حد ہلکی پھلکی تھی اور اُسے کنویں

میں گرادیا۔ہانپتے ہوئے ہم میں سے ہر ایک نے ایک قدم پیچھے ہٹایااور لاش کے
پانی میں گرنے کے چھپاکے کے انتظار کرنے لگے۔وہ آواز کبھی نہ آئی۔"۱۲

صوفیاکے ہر عمل کا مقصد صرف اور صرف اللہ کی رضا ہو تا ہے وہ چاہے جان دے کر بھی حاصل ہو جائے وہ اُسے بھی قبول کرتے ہیں۔ حسین بن منصور کا حلاج کا حال بھی ایسا ہی ہے۔ حسین نے حد سے زیادہ عبادات کیں اور حج کے فریضے بھی سرانجام دیے بس مقصد یہی تھا کہ خدا کی ذات اُس پر راضی ہو کر حقیقت کے رازوں کو اس پر منکشف کر دے۔ حسین بن منصور حلاج کو اللہ نے اپنی رضا اور قرب کا صلہ بااثر دعاؤں کی صورت میں دیا تھا اور وہ جب بھی کسی دکھی یا بیمار کے لیے دعا کرتے اسے شفا مل جاتی یا اگر وہ کسی کے حال کے بارے میں کوئی بات کہتے تو وہ پوری ہو جاتی۔ انھی باتوں کو لے کر لوگ ان کے مخالف ہونا شروع ہو گئے تھے۔اس اختلاف کی آگ نے اُس وقت شدت پکڑی جب حسین بن منصور حلاج نے اناالحق کا نعرہ لگایا۔ آخر حسین بن منصور نے بھی شمس تبریز کی طرح جان دے کر ہی خداتعالیٰ کی محبت میں مدغم ہونے کی قیمت ادا کی۔

"سر جھٹک کر، کوئی راہِ فرار نہ پا کر ابو عمر نے اس کاغذ پر اپنی مہر ثبت کر دی
اور فتویٰ لکھ دیا۔ اور پھر لوگوں نے قضاۃ نے اور شحنہ نے اور خود ابوالحسین
آشنائی نے اپنی اپنی مہریں لگائیں اور نام لکھے اور حسین ابن منصور کی موت
کے پروانے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔"۱۳

مجوزہ ناولوں میں جو چند بڑے بڑے اشتراکات تھے ان کا بالا سطور میں ذکر کر دیا گیا ہے۔تصوف کے حوالے سے جن مرکزی پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ان میں حقیقی علم کے حصول سے لے کر تمام مذاہب سے بالاتر ہو کر انسانیت سے محبت، پوری دنیا کو ایک ہی دائرہ سمجھنا، عشق حقیقی کے راز پانے اور راہِ خداوندی میں جان دینے تک کے امور میں مجوزہ ناولوں میں مماثلت کا اظہار پایا جاتا ہے۔ اور کچھ پہلوؤں اور باتوں میں تصوف کے حوالے سے مجوزہ ناولوں افتراقی پہلو بھی سامنے آئے ہیں ان کا ذیل میں ذکر کیا جائے گا۔

ب۔ افتراکات

ا۔ تصوف اور فرضی عبادت

صوفیا اپنی زندگی کو اللہ کے لیے وقف کرنے کے بعد ایسی کوئی خواہش نہیں رکھتے جن سے وہ اپنے مقصد سے دور ہو جائیں۔ صوفیا صرف اور صرف اللہ کی رضا چاہتے ہیں اور اس کے لیے کبھی اپنی جان کو اذیت دے کر مطلب بھوک پیاس برداشت کرتے ہوئے اپنے نفس کی تربیت کر کے اللہ کی رضا چاہتے ہیں اور کبھی صوفیا کرام شب بھر جاگ کر نفلی عبادات کرتے ہیں تاکہ اللہ کی رضا حاصل ہو جائے۔ ''چالیس چراغ عشق کے'' اور ''دشتِ سوس'' میں تصوف کا جائزہ لیتے ہوئے جزوی طور پر یہ اختلاف سامنے آیا ہے کہ شمس تبریز فرضی عبادات جس میں حج روزہ اور نماز کے اہتمام کو شماریات کہتے ہیں اور کہتے ہیں خدا کوئی پنساری نہیں جو ان کی نیکیوں کو تولتا ہے بلکہ وہ انسان سے محبت کو شمار کرتا ہے۔ شمس تبریز اپنے نفس کی تربیت کرتے ہیں اور خود کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر کے اللہ کی رضا چاہتے ہیں۔ شمس تبریز کا یہ نظریہ ہے کہ خدا مکہ مدینہ یا کسی مسجد میں نہیں بلکہ خدا اپنی مخلوق کے دلوں میں بستا ہے اگر اُس کی مخلوق سے محبت کی جائے تو وہ خود ہی خوش ہو جائے گا۔ اس طرح سے اللہ کی رضا حاصل کی جا سکتی ہے۔

"بے خبر و مدہوش مسلمان! اگر کوئی رمضان میں خدا کے نام پر روزے رکھتا ہے اور ہر عید پر اپنے گناہوں کی تلافی میں بھیڑ یا بکری کی قربانی دیتا ہے، اگر کوئی عمر بھر مکہ کا حج کرنے کی جدوجہد میں رہتا ہے اور دن میں پانچ بار نماز پر رکوع و سجود کرتا ہے مگر اس کے دل میں محبت کی کوئی گنجائش نہیں تو اس کی ساری محنت و مشقت کا کیا فائدہ؟۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے، خدا مکہ میں رہتا ہے یا مدینہ میں؟ یا پھر کہیں کسی مقامی مسجد میں؟ لوگ کس طرح یہ تصور کر سکتے ہیں کہ خدا کسی محدود جگہ میں مقیم ہو سکتا ہے جب کہ وہ خود کھل کر فرماتا ہے، میں آسمانوں میں اور زمین میں نہیں سما پاتا مگر اپنے بندے کے دل میں سما جاتا ہوں۔"[۱۴]

شمس تبریز مکہ مدینہ جا کر فرضی عبادات کرنے جن میں سے مرکزی عبادت حج جیسے مقدس فریضے کو بھی اتنی اہمیت نہیں دیتے جتنی اہمیت وہ محبت اورانسانیت کی خدمت کو دیتے ہیں۔انسانیت کی خدمت کے لیے وہ انسانوں کے ظاہر پر نہیں جاتے بلکہ ان کے باطن کو دیکھتے ہیں اور ان کی عزت کرتے ہیں کہ اللہ راضی ہو جائے۔

"دشتِ سوس" اور" چالیس چراغ عشق کے "کا تصوف کے تحت تقابل کرتے ہوئے یہ بات سامنے آئی کہ فرضی عبادات کی ادائیگی اور ان سے لگاؤ کے حوالے سے مذکورہ ناولوں میں جزوی اختلاف موجود ہے۔ حسین بن منصور حلاج بچپن سے ہی عبادات میں مگن رہتے تھے،پہلے انھوں نے قرآن پاک حفظ کیا اور پھر اس کے بعد اپنا زیادہ تر وقت فرضی اور نفلی نمازوں میں گزارتے تھے۔ حسین بن منصور حلاج کا یہ بھی یقین تھا کہ مکہ اور مدینہ جانے سے اللہ اور اس کے رسول سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ حسین کا اس بات پر قوی یقین تھا کہ روحِ زمین پر وہ ایک ایسی مقدس جگہ ہے جہاں گناہگاروں کے گناہوں کی تلافی ہوتی ہے۔ حسین چاہتا تھا کہ وہ بھی اللہ اور اس کے محبوب کے در پر حاضری دے اور اپنی مراد پائے اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں ابراہیمؑ نے دعا مانگی تو ان کی دعا پوری ہوئی اور پھر یہیں سے اللہ نے اپنے محبوب کو دیدار کے لیے بلایا تھا۔ حسین حج کے لیے اس امید کے ساتھ جاتا ہے کہ وہیں اس کی بھی مراد پوری ہو گی۔ حسین مکہ پہنچ کر بیت اللہ کے پاس ہی قیام کرتا ہے کہ اسے بلاوا آئے گا تو وہ تو اس گھر میں حاضری دے گا اور پھر حسین اس حاضری کے لیے دعا بھی کرتا ہے۔

> "حسین نے نہایت عاجزی سے جبینِ نیاز زمین پر رکھی۔بارِ الٰہی! میں بھی
> تیرا مشتاق ہوں اور اس لیے میں تیرے دوست کی دید کا مشتاق ہوں۔مجھے بلاوا
> ہے تو باریابی کی اجازت دے۔وہ مسجد الحلیفہ میں تھا جہاں رسولِ پاک نے احرام
> باندھا تھا۔مسجدِ قبا اور مقامِ مشہد امیر حمزہ تک مدینہ منورہ کا حرم تھا۔سفید میناروں
> اور مسجدوں کے گنبد دکھائی دے رہے تھے۔۔۔وفورِ شوق سے اس کے آنسو تھم
> نہیں رہے تھے۔"۱۵

تصوف کے حوالے سے یہ اختلاف سامنے آیا ہے کہ ایک صوفی کے نزدیک اللہ تعالی مسجدوں میں نہیں بلکہ اللہ انسانوں کے دل میں ہوتا ہے اور دوسرے صوفی کے نزدیک فرضی عبادات ضروری ہیں اور انھی کے ذریعے انسان اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکتا ہے۔فرضیعبادات میں حج کو خاص مقام حاصل ہے اور اس کی ادائیگی

کے لیے مکہ جانا پڑتا ہے۔ اسلام میں مکہ اور مدینہ کا خاص مقام ہے جہاں اللہ اپنے بندوں کی فریادوں کو سنتا ہے اور ان کی مرادیں پوری کرتا ہے اور گناہوں کی تلافی کرتا ہے۔

۲۔ تصوف اور محمد ﷺ

تصوف میں صوفیا کرام اپنی ذات کو خدا تعالیٰ کے لیے وقف کر دیتے ہیں اور پھر اپنے قلب کو اتنا وسیع کر لیتے ہیں کہ چاہے اس میں پوری انسانیت بھی سما جائے۔ قلب کو وسعت دیتے ہوئے بعض اوقات شرعی امور کی حدود بہت نیچے اور پیچھے رہ جاتی ہیں۔ اسی طرح کا معاملہ مجوزہ ناولوں میں سامنے آیا ہے جہاں "چالیس چراغ عشق کے" میں صوفی شمس تبریز ایک ایسی ہی حد کو اپنے قلب کی وسعت کے معاملے میں حد نہیں سمجھتے اور وہ بایزید بسطامی اور محمد ﷺ میں سے بایزید بسطامی کو بڑا آدمی گردانتے ہیں۔ شمس تبریز کے نزدیک بایزید بسطامی کا قلبی دائرہ محمد ﷺ سے بڑا تھا اور ان کے دل میں انسانیت کے لیے ہمدردی اور اصلاح کا اثر زیادہ تھا اس لیے وہ بڑے آدمی ہیں۔ مولانا روم اور شمس تبریز کی پہلی ملاقات میں بھی یہی سوال سامنے آتا ہے اور پھر مولانا روم بھی شمس تبریز کی اس بات سے متفق ہو جاتے ہیں۔

> "مجھے بتائیے کہ آپ کے خیال میں ان دونوں میں سے کون عظیم تر ہے:
> پیغمبر محمد ﷺ یا صوفی بسطامی؟"۔۔۔ کیا پیغمبر ﷺ نے کہا نہیں تھا،
> "اے خدا مجھے معاف فرما دے، میں تجھے ویسے نہیں جان سکا جیسا کہ مجھے جاننا
> چاہیے۔" جب کہ بسطامی نے کہا تھا، "تعریف ہے میرے لیے، میں خدا کو اپنی
> چادر تلے رکھتا ہوں؟" اگر ایک خود کو خدا کے مقابلے میں اس قدر حقیر سمجھتا
> ہے جب کہ دوسرا خدا کو اپنے اندر رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے تو دونوں میں سے
> کون عظیم ہے؟"١٦

تصوف میں اپنی ذات کی نفی اور قلب کی وسعت ایسی سرگرمیاں ہیں جن کو سرانجام دیتے ہوئے بعض صوفی شرعی مقام و مراتب کا وزن صرف خدا کی محبت کے ترازو سے کرتے ہیں اور شرعی حدود و قیود ان کے لیے بہت چھوٹی پڑ جاتی ہیں۔ مگر حسین بن منصور حلاج ایک ایسے صوفی ہیں جو شرعی حدود و قیود کا خیال کرتے

ہوئے محمد ﷺ کو بجا طور پر اللہ کا آخری رسول اور دنیا و جہان کا سب سے بڑا آدمی مانتے ہیں۔ حسین بن منصور حلاج بھی خود کو اللہ کی رضا و خوشنودی کے لیے وقف کر چکے ہیں اور وہ اس کے ساتھ ساتھ انسانیت کی خدمت اور انسانوں کی خوشی بھی چاہتے ہیں مگر شرعی امور کی حدود کو حدود ہی سمجھتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ اللہ کے رسول محمد ﷺ کو دنیا کا سب سے بڑا آدمی مانتے ہیں اور ان کو ہی باعثِ کائنات مانتے ہیں۔ حسین جب حج کے لیے جاتے ہیں تو وہ مدینہ پہنچ کر منبر رسول کے سامنے کھڑے ہو کر آپ ﷺ کو اپنی حاضری کا بتاتے ہیں اور ان کے واسطے سے دعائیں کرتے ہیں۔ حسین بن منصور کے محمد ﷺ کو باعثِ کائنات ماننے کے حوالے سے جمیلہ ہاشمی دشتِ سوس میں لکھتی ہیں۔

"یہ ارض و سماء یہ کائنات جس کے لیے بنائے گئے وہ سلطانِ عالم محمد عربی "١٧

٣۔ تصوف اور خدا کی ذات:

تصوف میں جب صوفی اپنی ذات کی نفی کرتا ہے تو اس کا مقصد خدا تعالیٰ کی خوشنودی ہی ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے میرے اس کام سے خدا تعالیٰ راضی ہو جائے اور مجھے اس کا قرب مل جائے۔ اس قرب کے حصول کے لیے صوفیا اپنے نفس کی تربیت کرتے ہیں اور خود کو اس قدر ملامت کرتے ہیں وہ اپنی ذات کی نفی کر لیتے ہیں اور ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب ''میں'' نہیں رہتی۔ اللہ کی رضا کے لیے ایک صوفی اللہ کی مخلوق کی خوشی چاہتا ہے اور مخلوق کے ساتھ ہمدردی کے مختلف طریقے اپناتا ہے اور ان کے باطن کو سنوارنے کی بھی کوشش کرتا ہے اور وہ اسی کام کو اپنی کامیابی سمجھتا ہے۔ انسانیت سے محبت اور ہمدردی سے صوفی اپنی ذات کی نفی کر کے اللہ کا قرب چاہتا ہے۔ ''چالیس چراغ عشق کے'' میں شمس تبریز بھی ایک ایسے ہی صوفی کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ وہ انسانیت کے ساتھ ہمدردی اور محبت کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ ان پر راضی ہو جائے۔ اللہ کے قرب اور محبت کے لیے وہ انسانوں کے ظاہر پر نہیں جاتے بلکہ ان کے باطن کو دیکھتے ہیں۔ اسہمدری اور محبت میں انسانوں کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے وہ ان میں کسی قسم کی کوئی تفریق نہیں کرتے۔ شمس تبریز خدا کی محبت تو چاہتے ہیں مگر خود کو خدا کی مخلوق سمجھتے ہیں مطلب خود کو خدا کی ذات میں مدغم نہیں کرنا چاہتے اور وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ خدا خدا ہے اور بندہ بندہ ہے اس لیے وہ خدا کی ذات میں مدغم نہیں ہو سکتا۔

تصوف میں جب اپنی ذات کی نفی کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اب صوفی کی اپنی کوئی ذات نہیں رہی اور اس کی ذات اپنے مالکِ حقیقی کی ذات میں مدغم ہو چکی ہے۔ ایسا ہی نظریہ ''دشتِ سوس'' میں حسین بن منصور حلاج کے حوالے سے سامنے آتا ہے وہ اپنی ذات کی یہاں تک نفی کرنا چاہتے ہیں کہ اپنی ذات کو تحلیل کر دینا چاہتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کی اپنی کوئی پہچان نہ رہے۔ حسین بن منصور حلاج کی ذات کے حوالے سے جمیلہ ہاشمی ''دشتِ سوس'' میں لکھتی ہیں:

"جب حسین کے کان میں اس کی آواز پڑ جاتی تو وہ سر تا پا کانپ جاتا۔ وہ محبوب بننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو اس کی محبت بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے تو خود اس میں فنا ہونے مٹ جانے کا شوق تھا۔ اسے تو صرف اس کا شوق تھا۔ اسے اپنی ہستی سے اپنے ہونے سے کوئی محبت نہ تھی۔" ۱۸

حسین بن منصور تمام عبادات اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ ان پر راضی ہو جائے اور ان کی ذات کو اپنی ذات میں مدغم کرلے۔ حسین بن منصور بچپن سے ہی یہ تڑپ اپنے اندر لیے ہوئے تھے کہ ان کی اپنی کوئی ذات نہیں اور اصل ذات تو وہی ہے اور اس کو اپنی ذات کی ضرورت بھی نہیں۔

۴۔ تصوف اور ابلیس کا تصور:

صوفیا کے نزدیک انسان کے بھٹکنے کی وجہ اس کا اپنا نفس تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر انسان اپنے نفس کی تربیت کرلے تو وہ اچھائی کے راستے پر رواں دواں رہ سکتا ہے۔ انسان کی تربیت اور اس کو ورغلانے میں نفس کا سب سے اہم کردار ہے۔ اگر نفس کی تربیت کرتے ہوئے مقام راضیہ تک پہنچایا جائے تو یہی نفس انسانیت کے لیے اصلاح کا باعث بن جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مجوزہ ناولوں میں یہ جزوی اختلاف بھی سامنے آیا ہے کہ ''چالیس چراغ عشق کے'' میں شمس تبریز انسانی نفس کی تربیت پر زور دیتے ہیں اور وہ شیطان کے ورغلانے یا بھٹکانے کو اہمیت نہیں دیتے۔ شمس تبریز کے نزدیک شیطان کوئی بیرونی طاقت نہیں بلکہ یہ انسان کے اندر ہی ایک معمولی سی طاقت ہے جس پر انسان قابو پا سکتا ہے۔ شیطان کو باہر تلاش کرنے اور اس سے لڑنے کی بجائے انسان اپنے نفس کی تربیت کرے اور یہی انسان کی برائی سے خلاصی اور نیکی کے لیے فتح ہے۔ شیطان کے حوالے سے شمس تبریز کہتے ہیں:

"اس لیے شیطان کو بھی اپنے باہر تلاش نہ کرو۔ شیطان باہر سے حملہ آور ہونے

والی کوئی غیر معمولی طاقت نہیں ہے۔ وہ تمہارے اندر ہی موجود معمولی آواز
ہے۔ اگر تم خود کو پوری طرح جان لو، اپنے تاریک اور روشن رُخ دونوں کا ایمان داری
اور شدت سے سامنا کر لو تو تم شعور کی اعلیٰ ترین صورت کو پہنچ جاؤ گے۔"۱۹

"دشتِ سوس" میں حسین بن منصور حلاج شیطان کے حوالے سے شرعی یقین رکھتے ہیں اور وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ شیطان کو حضرت آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں دنیا میں وارد کیا گیا اور پھر انسان کا دشمن بن گیا۔ شیطان اپنی ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ وہ انسان کو ورغلائے اور اس کو بدی کے راستے پر گامزن کرے۔ شیطان کے حوالے سے حسین امام رازی کو بتاتے ہیں:

"حسین پھر ہنسا۔'' آقا۔ آپ سمجھتے ہیں کلامِ پاک میں جو لکھا ہے وہ اس
بات کے سوا نہیں جو میں نے کہی ہے۔ خدا نے آدم کو بھی بنایا اور ابلیس کو
بھی بنایا۔'''' ٹھیک'''' آدم کی پیشانی میں اپنا نور رکھا۔'''' رکھا'''' فرشتوں
کو حکم دیا کہ اسے سجدہ کرو۔ سب نے کیا مگر ابلیس نے نہیں کیا۔ وہ راندہ درگاہ
ہوا۔ عرش سے نکالا گیا۔ خوار ہوا۔ انسانوں کو گمراہی میں مبتلا کرنے کرنے
کے لیے وہ بھی دنیا میں وارد ہوا۔"۲۰

حسین بن منصور حلاج یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر شیطان نہ ہوتا تو دنیا میں اتنی رونق نہ ہوتی اور پھر سب لوگ ایک ہی راستے پر ہوتے تو کسی بھی انسان کا امتحان نہ ہوتا۔ شیطان کے ذریعے اللہ اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔

۵۔ تصوف اور سزا و جزا کا تصور:

دنیا دارالعمل ہے اور آخرت جزا و سزا کا گھر ہے۔ اسلام کو ماننے والا ایک عام انسان یہ مانتا ہے دنیا کے اعمال کی جزا و سزا انسان کو دوسرے جہان میں ضرور ملے گی مطلب اگر ایک انسان دنیا میں اچھے اعمال کرے گا تو اس کو آخرت میں جنت کی صورت میں انعام ملے گا۔ ایک صوفی بھی اپنے خالق کی خوشنودی چاہتا ہے۔ مجوزہ ناولوں میں تصوف کا جائزہ لیتے ہوئے یہ جزوی اختلاف سامنے آیا ہے کہ ''چالیس چراغ عشق کے'' میں شمس تبریز کے حوالے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جنت، جہنم کا کوئی تصور نہیں بلکہ انسان کے اعمال اس کی محبت اور نفرت سے پیوستہ ہیں۔ ایک انسان محبت کرتا ہے تو یہی دنیا اس کے لیے جنت ہے اگر وہ

نفرت کرتا ہے تو یہی دنیا اس کے لیے دوزخ ہے۔اس ناول کے تجزیے سے یہ بات سامنے آئی کہ شمس تبریز کا تصور انسان سے محبت ہے اور یہی محبت اس کی راحت اور اس کے خالق کی رضا ہے۔

"دوزخ ابھی اور یہیں موجود ہے۔اسی طرح جنت بھی یہیں موجود ہے۔
دوزخ کے بارے میں پریشان ہونا یا جنت کے خواب دیکھنا چھوڑ دو کیوں کہ
وہ خود ہر لمحے کے اندر موجود ہیں۔ہر مرتبہ جب ہم محبت میں گرفتار ہوتے
ہیں، ہم جنت میں پہنچ جاتے ہیں۔ہر مرتبہ جب ہم نفرت و حسد کرتے ہیں
یا کسی سے لڑتے ہیں، ہم لڑکھڑا کر جہنم کی آگ میں جا گرتے ہیں۔"۲۱

یہاں شمس تبریز اس دنیا میں محبت اور نفرت کو جنت جہنم کا نام دیتے ہیں وہیں ''دشتِ سوس'' میں حسین بن منصور حلاج جنت اور جہنم کا یقین رکھتے ہیں۔ حسین کہتا ہے کہ اگر جنت، جہنم کا تصور نہ ہوتا تو دنیا میں کوئی بھی انسان اس کے حصول کے لیے کاوش نہ کرتا۔دنیا میں جہاں انسان اچھے اعمال کرتا ہے وہیں وہ آخرت میں جنت کی امید رکھتا ہے اور ساتھ ساتھ برے اعمال کے بدلے میں آخرت میں دوزخ کا خوف بھی رکھتا ہے۔ حسین جہاں شیطان کا ذکر کرتا ہے وہیں وہ جنت کا بھی ذکر کرتا ہے مطلب جس انسان نے خود کو شیطان سے بچا لیا وہ کامیاب ہوا اور جنت کا مہمان بن گیا۔ حسین بن منصور حلاج کے مطابق دنیا کی رنگینی جنت کے تصور کے طفیل ہی ہے۔ حسین بن منصور شیطان کا ذکر کرتے ہوئے جنت کی اہمیت کو بھی نہیں بھولتے مطلب وہ شیطان اور جنت کو متضاد کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ حسین شیطان کی بات کرتے ہوئے جنت کی اہمیت بھی واضح کرتے ہیں:

"انسانوں کو گمراہی میں مبتلا کرنے کے لیے وہ بھی دنیا میں وارد ہوا۔اگر
وہ نہ ہوتا تو کوئی گمراہی میں مبتلا کیونکر ہوتا۔اور یہ سوز و سازِ حیات ہی نہ ہو
وہ نہ ہو تو جنت نہ ہو۔اس کی تڑپ نہ ہو۔اس کے حصول کے لیے کد و کاوش
نہ ہو۔"۲۲

دنیا میں جہاں انسان اچھے اعمال کرتا ہے وہیں وہ آخرت میں جنت کی امید رکھتا ہے اور ساتھ ساتھ برے اعمال کے بدلے میں آخرت میں دوزخ کا خوف بھی رکھتا ہے۔ حسین جہاں شیطان کا ذکر کرتا ہے وہیں وہ جنت کا بھی ذکر کرتا ہے مطلب جس انسان نے خود کو شیطان سے بچا لیا وہ کامیاب ہوا اور جنت کا مہمان بن گیا۔

حوالہ جات:

۱۔ ایلف شفق، ہما انور (مترجم) چالیس چراغ عشق کے، جمہوری پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۱۷، ص ۱۸۰
۲۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۱، ص ۲۶۳
۳۔ بابا ذہین شاہ تاجی، کتاب الطواسین لامنصور الحلاج، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۵، ص ۸
۴۔ مسز فاطمہ برہان سروری قادری، (مضمون) مشمولہ سُلطان الفقر، جلد ۱۵، جون ۲۰۲۱، ص ۱۰
۵۔ ایلف شفق، ہما انور (مترجم) چالیس چراغ عشق کے، جمہوری پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۱۷، ص ۱۷۰
۶۔ ایضاً ص ۱۹۸
۷۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۱، ص ۱۰۰
۸۔ ایلف شفق، ہما انور (مترجم) چالیس چراغ عشق کے، جمہوری پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۱۷، ص ۱۹۶
۹۔ ایضاً ص ۲۹۹
۱۰۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۱، ص ۱۵۰
۱۱۔ ایضاً ص ۴۵۶
۱۲۔ ایلف شفق، ہما انور (مترجم) چالیس چراغ عشق کے، جمہوری پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۱۷، ص ۳۵۶
۱۳۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِسوس، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۱، ص ۲۷۴
۱۴۔ ایلف شفق، ہما انور (مترجم) چالیس چراغ عشق کے، جمہوری پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۱۷، ص ۱۹۶
۱۵۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۱، ص ۱۹۶۔۱۹۷
۱۶۔ ایلف شفق، ہما انور (مترجم) چالیس چراغ عشق کے، جمہوری پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۱۷، ص ۱۷۰
۱۷۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۱، ص ۱۹۸
۱۸۔ ایضاً ص ۱۹۳
۱۹۔ ایلف شفق، ہما انور (مترجم) چالیس چراغ عشق کے، جمہوری پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۱۷، ص ۱۲۴
۲۰۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۱، ص ۲۰۳
۲۱۔ ایلف شفق، ہما انور (مترجم) چالیس چراغ عشق کے، جمہوری پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۱۷، ص ۱۹۸
۲۲۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۱، ص ۲۰۳

باب پنجم: مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات

مجموعی جائزہ

ایلف شفق اور جمیلہ ہاشمی دونوں ہی ناول نگار تاریخی ناول نگاری کے حوالے سے جانی جاتی ہیں۔ایلف شفق "چالیس چراغ عشق کے" سے پہلے بھی "Pinhan" اور دیگر کئی تاریخی ناول لکھ چکی ہیں۔انہوں نے تاریخی واقعات کو بھی اپنے تخیلاتی مزاج کی ملاوٹ کے ساتھ ایک خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔تاریخ تو ماضی کے کسی ایک واقعے کا نام ہوتا ہے اور وہ واقعہ کسی نہ کسی صفحے پر محفوظ ہی ہوتا ہے مگر جب وہ واقعہ تخیل کے لحاف میں لپٹ کر ادب کے تاریخی صفحے پر محفوظ ہوتا ہے تو اس کی عمر اور اس کے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ایلف شفق نے مولانا رومی اور شمس تبریز جیسے بزرگوں کی خدا اور اس کی مخلوق سے محبت کو موجودہ دور کے حالات کے ساتھ ایسے جوڑ کر پیش کیا ہے۔ایلف شفق نے مولانا روم کی طلب اور تڑپ اور دوسری طرف شمس تبریز کی دعا کسی ایسے رفیق کی طلب جو ان کے علم اور رازوں سے مستفید ہو کر انسانیت تک یہ باتیں پہنچائے کو اپنے ناول میں اکیسویں صدی کی امریکن خاتون ایلا اور مسلم صوفی اے عزیز ظہارا کے ساتھ جوڑ کر بڑے خوبصورت جامے میں پیش کیا ہے۔

ایلف شفق انگریزی زبان میں ناول نگاری کے حوالے سے ایک خاص پہچان رکھتی ہیں اور موجودہ دور کی نوجوان نسل میں وہ بے حد مقبول بھی ہیں۔ایلف شفق نے اپنے ناولوں میں مشرقی اور مغربی رویوں کا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔وہ اپنے ناولوں میں حقیقت اور تخیل کے ملاپ سے ایک خوبصورت منظر پیش کرتی ہیں۔وہ موجودہ دور میں ترکی ادب اور انگریزی ادب کے لیے ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتی ہیں۔انہوں نے خواتین کے مسائل، تہذیب و ثقافت، تاریخ، تارکینِ وطن اور تصوف کے حوالے سے بہت سی اہم تحریریں پیش کی ہیں۔ایلف شفق وہ ناول نگار ہیں جن کو ان کے پہلے ہی ناول "Pinhan" پر ۱۹۹۸ء میں رومی پرائز سے نوازا گیا۔یہ بات ان کی مقبولیت اور قابلیت کے لیے سندِ صادق کا درجہ رکھتی ہے۔

"چالیس چراغ عشق کے" ایلف شفق کا مشہور ترین ناول ہے جس کی بنیادی زبان انگریزی ہے اور ایک سال بعد اسے "Ask" کے نام سے ترکی زبان میں بھی ترجمہ کیا گیا اور ترکی زبان میں بھی اسے برابر مقبولیت حاصل ہوئی۔اردو زبان میں ہما انور نے "چالیس چراغ عشق کے" کے نام سے ترجمہ کر کے حسن عسکری ایوارڈ حاصل

کیا۔ اردو زبان میں بھی اس ناول کو بے پناہ مقبولیت ملی۔ اس مقالے میں تصوف کے حوالے سے اس ناول کا جائزہ لیا گیا اور تصوف کے عناصر کا "دشتِ سوس" میں موجود تصوف کے عناصر کے ساتھ تقابل کیا گیا۔ "چالیس چراغ عشق کے" میں موجود تصوف کے عناصر مولانا روم، شمس تبریز، ایلا، اے عزیز ظہارا کے ذریعے دکھائے گئے ہیں۔ ان کرداروں کی مدد سے انسانی محبت اور خوشی کے حصول اور خدا کے قرب کے حصول کے ذرائع دکھائے گئے ہیں۔ اس ناول کے ذریعے مذہب، ثقافت اور علاقیت سے بالاتر محبت دکھائی گئی ہے۔ اس ناول میں تصوف کے حوالے سے ایک بڑی بات یہ بھی سامنے آئی کہ بظاہر جس انسان کو دنیا اور دین والے برا سمجھتے ہیں صوفی اس کے اندر کے انسان کو پہچان لیتا ہے اور اس کی اندرونی اچھائی کو سامنے رکھتے ہوئے اس سے محبت اور اس کی تعظیم کرتا ہے۔

ایلف شفق نے مغرب میں آنکھ کھولی اور جس خطے کو باہر سے جتنا روشن پایا وہ اس قدر ہی اندر سے بھی کھوکھلا نکلا کیونکہ ایلف شفق ایک سال کی تھیں کہ ان کے والدین کے درمیان علیحدگی ہو گئی اور اس بات نے ان پر گہرا اثر ڈالا۔ اس علیحدگی کے بعد ان کی والدہ ان کو اپنے ساتھ لے کر ترکی آ گئیں اور پھر ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت مشرقی آب و ہوا میں ہوئی۔ ایلف شفق بچپن میں ہی والد کی محبت سے محروم ہو گئی اور پھر اس خلا کو پر کرنے کے لیے کتابوں کا مطالعہ کرتی رہیں۔ ایلف شفق کو تاریخ سے گہرا لگاؤ تھا اور انھوں تصوف اور تاریخی کتب کا خوب مطالعہ کیا اور وہ محبت کا خلا جو ان کے ارد گرد تھا انھی کتابوں نے پر کیا اور جس کے اثرات ان کی آج تک کی تحریروں میں نظر آ رہے ہیں۔

ایلف شفق اپنی تحریروں سے یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ دنیا کے تقسیم در تقسیم کے دائرؤں سے نکل کر محبت اور خالص محبت کو عام کیا جائے۔ ایلف شفق نے جس بات کی کمی کو شدت سے محسوس کیا وہ محبت کی ناپیدگی تھی۔ اس ناپیدگی نے انسان کو اندر سے کھوکھلا اور باہر سے نیم مردہ اور وحشی بنا کر رکھ دیا تھا۔ دین اور دنیا کا علم محبت کے بغیر مکمل ہوتا تو شمس تبریز مولانا روم کے لیے دعا نہ کرتے اور صرف دعا ہی نہیں بلکہ انھوں نے مولانا رومی کو محبت کے اصول سمجھائے اور پھر انسانیت سے بلا تقسیم محبت کا درس دیا۔ ایلف شفق نے اس بات کو محسوس کیا جیسے زمانہ ماضی اور حال، مشرق اور مغرب اور دین اور دنیا میں تقسیم ہو چکا ہے۔ اس تقسیم کو اگر ایک دائرے

میں بند کیا جا سکتا ہے تو وہ تصوف ہے۔ ایلف شفق نے اس تصوف کے لیے ذریعے صرف مذہب یا خدا کی ذات میں مدغم ہو کر خود کی نفی کرنے کو ہی بیان نہیں کیا بلکہ خدا کی پیدا کردہ انسانیت سے بے پناہ محبت کو بھی عام کر دیا ہے۔ ایلف شفق اگر مشرق یا مسلم دنیا کے تصوف کو بیان کرنا چاہتیں تو ایک صوفی کی اپنے خدا سے محبت کو واضح کر دیتی یا پھر وہ ایک صوفی کا اپنے نفس کو ملامت کر کے اپنی ''میں ''کو ختم کرنے کو واضح کر دیتیں مگر ان کے نزدیک پوری دنیا اہم تھی اور اس وقت پوری دنیا کو ایسی محبت کی ضرورت ہے جو پر خلوص ہو اور بلا تقسیم ہو۔

جمیلہ ہاشمی اردو ناول نگاری میں ایک اہم نام ہیں۔ جمیلہ ہاشمی نے اردو ناول نگاری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری میں بھی جوہر دکھائے۔ جمیلہ ہاشمی کے تعارف کے حوالے سے باب سوم میں ان کی بات ہو چکی ہے۔ یہاں پر صرف ان کے ناول ''دشتِ سوس'' کے حوالے سے بات کرتے ہوئے بات کو سمیٹا جا رہا ہے اور مجموعی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ جمیلہ ہاشمی اپنے ناول ''تلاشِ بہاراں'' پر آدم جی ایوارڈ حاصل کر چکیہیں۔ جمیلہ ہاشمی کا ناول ''دشت سوش'' تصوف کا اہم باب اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اسے ایک تاریخی ناول بھی سمجھنا چاہیے کیونکہ اس ناول میں حسین بن منصور حلاج کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس ناول میں جن بزرگ ہستیوں اور تاریخی ادوار کا ذکر کیا گیا ہے وہ زیادہ تر حقیقت پر مبنی ہیں۔ ناول اگرچہ حقیقی زندگی کی کوئی تصویر پیش کر رہا ہوتا ہے مگر اس کو تخیل کا زیور ضرور پہنایا جاتا ہے اور یہ کام جمیلہ ہاشمی نے بھی کیا ہے۔

جمیلہ ہاشمی کے تعارف کے حوالے سے باب سوم میں تفصیل سے بات کی جا چکی ہے۔ یہاں پر صرف ان حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے ناول کے حوالے سے مجموعی جائزے کو پیش کیا جا رہا ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے انگریز کے ہندوستان میں آنکھ کھولی جہاں اس وقت کچھ علاقوں میں تو نفرت کا بازار گرم تھا مگر کچھ علاقوں میں آپسی محبت ایک مثال تھی۔ جمیلہ ہاشمی نے امرتسر کے جس علاقے میں آنکھ کھولی وہاں سکھوں اور مسلمانوں کے آپس میں اچھے تعلقات تھے اور گھریلو سطح پر ایک دوسرے لین دین اور خوشی و غم کے رسم و رواج میں سانجھ تھی۔ جمیلہ ہاشمی کی والدہ ایک سکول میں ہیڈ مسٹریس تھی اس بات کا بھی اثر ان کی تربیت میں نظر آتا ہے کہ انھوں نے ابتدائی دور سے ہی کتابوں سے تعلق گہرا کر لیا تھا۔ انہوں نے بعد ازاں انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا جس سے ادب سے ان کا رشتہ اور بھی گہرا ہو گیا اور مختلف زبانوں کے ادبی متون کا مطالعہ کرنے سے ان کی تحریروں میں معنوی گہرائی اور اسلوب کی انفرادیت موجود ہے۔

جمیلہ ہاشمی نے اپنی ابتدائی عمر میں ہی برصغیر کی تقسیم کا سانحہ دیکھا تھا جس سے ان کی شخصیت پر بھی اثرات مرتب ہوئے اور بعد ازاں ان اثرات کو ان کی تحریروں میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ وہ ایک ایسا سانحہ تھا جس کا اثر بہت سے ادبا اور شعرا نے قبول کیا اور پھر اس کو کس طرح بیان کیا وہ ان کی تعلیم و تربیت، ماحول اور ذاتی پسند کے مطابق تھا۔ مگر جمیلہ ہاشمی ایک ایسی ادیبہ تھیں جنھوں نے مختلف خطوں کی ثقافت اور تاریخ کو حد درجے کی لگن سے اپنی تحریروں میں جگہ دی ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے دشتِ سوس کے علاوہ بھی تاریخی ناول لکھے

''دشتِ سوس'' جمیلہ ہاشمی کا ایک کرداری ناول ہے جس میں اس نے اناالحق کا نعرہ لگانے والے حسین بن منصور حلاج کا قصہ بیان کیا ہے۔ ناول میں کچھ تخیلاتی باتیں بھی نظر آتی ہیں جیسے اغول اور حسین کے قصے کو ایک عشقیہ داستان کے روپ میں حد سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں حسین کی موت اناالحق کے نعرے سے بڑھ کر حامد بن عباس کی رقابت کے تحت نظر آتی ہے۔ اس ناول میں بیان کردہ تصوف کے عناصر کا جائزہ لیا گیا اور ان عناصر میں ابتدائی عنصر جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ حسین بچپن سے ہی خدا کی ذات کے بارے میں اور مقدر کے بارے میں جاننے کا خواہاں نظر آتا ہے اور ان حقائق کو پانے کے لیے سہل عبداللہ تستری کے مدرسے میں اپنے استاد کی غیر موجودگی میں ان کے کچھ خفیہ رسائل کا مطالعہ کرتا ہے۔ ان رسائل کے مطالعے سے بھی حسین کی لگن اور جذبہ نظر آتا ہے کہ وہ حقائق کو جاننے کے لیے کس قدر بیتاب نظر آتا ہے۔ اس ناول میں حسین اور تصوف کے حوالے سے جو دوسری اہم بات نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ حسین خدا کی زمین کو گھوم پھر کر دیکھنے کا دلدادہ نظر آتا ہے۔ حسین بن منصور صرف علم اور دنیا کی سیر کا ہی خواہش مند نظر نہیں آتا بلکہ وہ انسانوں کے ساتھ بلا تفریق محبت اور ہمدردی کا بھی داعی نظر آتا ہے۔

اس ناول میں تصوف کے حوالے سے حسین اور اغول کا عشق بھی سامنے آتا ہے مگر یہ عشق جسمانی حدود سے بالاتر اور روحانی جذبات میں حد سے گزرا ہوا نظر آتا ہے۔ اغول اور حسین ایک دوسرے کی پہچان رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی روحانی پاکیزگی اور مقاصد کی بلندیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ حسین بن منصور حلاج کی عبادت و ریاضت کا مقصد صرف اور صرف خود کو خدا کی ذات میں مدغم کرنا تھا اور آخر ایک وقت آتا ہے جب حسین بن منصور حلاج اس مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ حسین بن منصور حلاج کا یہی دعویٰ ہی حسین کی موت کا باعث بنتا ہے۔

دونوں ناولوں میں تصوف کے حوالے سے جو باتیں سامنے آتی ہیں ان میں انسانیت سے بلا تفریق محبت اور ہمدردی ہے۔ انسان اس وقت تک انسانیت کے مرتبے پر فائز نہیں ہو سکتا جب تک اس کے اندر انسانیت سے محبت نہ ہو۔ حسین بن منصور حلاج ،اغول ، شمشتبریز،رومی،ایلا اور اے عزیز ظہارا کے ذریعے اس محبت کو علاقائی،لسانی،مذہبی اور جنسی تقسیم سے بالاتر دکھایا گیاہے۔ مجوزہ ناولوں کے تقابل سے یہ بات سامنے آتی ہے محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس کے لیے انسان جان تک کی قیمتی چیز کی پرواہ نہیں کرتا۔ اگر ایک انسان کو اپنے خدا سے محبت ہو جائے تو وہ اس ذات میں مدغم ہونے کے لیے پہلے اپنے نفس کی قربانی اور پھر اپنی جان تک کی قربانی دے کر اپنے محبوب میں مدغم ہو جاتاہے۔ اور اگر یہی محبت ایک انسان کو خدا کے لیے ایک انسان سے ہو جائے تو بھی اپنی جان تک قربان کر کے شمس تبریز کی صورت میں حیات جاوید پالیتاہے اور انسانیت کے لیے محبت کی مثال قائم کر دیتاہے۔ تصوف سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ محبت کبھی مرتی نہیں وہ ہر دور میں زندہ رہتی ہے۔ اگر ایک صوفی کسی دور میں انسانیت سے محبت کی اعلی مثال قائم کر کے دارِ فانی سے چلا جاتا ہے تو بعد میں وہ محبت کسی اور انسان کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ جیسے محبت ایک لافانی جذبہ ہے اسی طرح صوفیا بھی ایک سلسلے کی کڑیاں ہوتے ہیں یعنی ایک صوفی گیا تو اس کی روح کسی اور صوفی کی صورت میں زمین پر نمودار ہو جاتیہے۔ یہی مثال ایلف شفق نے مولانا روم کو ایلا کی صورت میں اور شمس تبریز کو اے عزیز ظہارا کی صورت میں پیش کر کے دی ہے۔

نتائج:

اس تحقیق کے بعد درج ذیل نتائج سامنے آئے ہیں۔

ا۔ "چالیس چراغ عشق کے " میں انسانیت سے محبت کو بنیاد بنایا گیاہے اور " دشتِ سوس " میں انسان اور خدا کی محبت کا رشتہ گہرا ہے۔

ایلف شفق نے ''چالیس چراغ عشق کے'' میں تصوف کے زمینی حقائق کو سامنے رکھ کر ان باتوں کو شمس تبریز اور مولانا روم کے ذریعے بیان کیاہے جن کی انسانیت کو ہر دور میں ضرورت ہوتی ہے۔ محبت مذاہب کی حدود، عمروں کی قید اور ذاتوں کی پہچان سے بالاتر ہوتی ہے۔ شمس تبریز نے زندگی کے تمام اصول انسانیت سے محبت سے پیوستہ کر کے مولانا روم کو پڑھائے ہیں۔

۲۔ عشق روح انسانی سے واقف ہونے اور خدا تک رسائی کا مختصر ترین راستہ ہے۔ ''چالیس چراغ عشق کے ''میں صوفیا انسانیت سے عشق میں خدا کے متلاشی نظر آتے ہیں کے اور'' دشت سوس '' میں فرد خاص خود میں خدا کا متلاشی نظر آتا ہے۔

"چالیس چراغ عشق کے" میں موجودہ دور کے انسانوں کی روحانی بے چینی کو پیش کیا گیا ہے۔ ایلف شفق نے اس بات کو ایلا کے ذریعے بیان کیا ہے کہ اگر آپ بڑے بنگلے میں رہتے ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک اعلیٰ کھانا کھاتے ہیں مگر آپ کو محبت میسر نہیں تو آپ کی روح سکون میں نہیں۔ ایلا کو دیکھ کر یہ بات بھی سامنے آئی کہ انسان چاہے مشرق سے ہو یا مغرب سے ہو، اسلام سے ہو یا عیسائیت سے ہو وہ جب بے چین ہوتا ہے تو قیود سے نکل کر روح کے سکون کے لیے نکلتا ہے۔

۳۔ "چالیس چراغ عشق کے'' میں ایلف شفق نے مشرق، مغرب اور ماضی حال کا فرق ختم کرنے کے لیے صوفی کے ذریعے محبت کی مثال پیش کی ہے۔ ایلف شفق نے محبت کو ایک مضبوط مادے کے طور پر پیش کر کے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ محبت میں اتنا دم ہے جو ماضی اور حال کے فرق کو ختم کر سکتی ہے۔

۴۔ "چالیس چراغ عشق کے ''میں مولانا روم اور شمس تبریز کے ذریعے زمانہ ماضی اور حال کے انسان کے درمیان فرق کو ختم کرنے کے لیے محبت کو بنیاد بنا کر پوری انسانیت کی تاریخ پیش کی گئی ہے اور'' دشت سوس ''میں حسین بن منصور حلاج کے ذریعے ایک خدا کے طالب صوفی کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔

"چالیس چراغ عشق کے'' سے ایلف شفق نے شمس تبریز کے ذریعے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ ایک صوفی کے نزدیک اپنی جان سے بڑھ کر اپنا مقصد عزیز ہوتا ہے۔ صوفی اپنے مقصد تک رسائی کے لیے جان تک کی بازی لگا دیتا ہے۔ شمس تبریز نے جس رفیق کے لیے دعا مانگی تھی وہ مولانا روم کی صورت میں پوری ہوئی اور مولانا روم کی صحبت میں رہتے ہوئے ایک زمانہ شمس تبریز کا مخالف ہو گیا مگر انھوں نے مخالفت کی پرواہ نہ کی بلکہ جان تک قربان کر دی مگر اپنے رفیق کی محبت سے منحرف نہ ہوئے۔

۵۔ صوفی صرف خدا سے ہی نہیں بلکہ اس کی مخلوق سے بھی محبت کرتا ہے کیونکہ مخلوق کے دل میں گھر کرنا ہی خدا کی محبت سمجھتا ہے۔ ''چالیس چراغ عشق کے'' سے تصوف کے حوالے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ایک صوفی کسی بھی شخص کی ظاہری حالت کو دیکھے بغیر اس کے باطن سے محبت کرتا ہے اور اس کے باطن کی اصلاح چاہتا ہے۔

۶۔ عورت کا کردار مخالف جنس کو روح کی انسیت سے واقف کروانے کی صفات پر مبنی کردار ہے۔ ''چالیس چراغ عشق کے ''میں موجود کمیا کا شمس سے عشق اور ایلا کا اے عزیز ظہارا سے عشق اور دشتِ ''سوس ''میں حسین اور اغول کا عشق یہ سب مجازی عشق جسمانی ضرورت سے پاک حقیقی عشق کے عکاس ہیں۔

عشق روح کا شناس، سچی جذباتیت کا عکاس اور قربانی کا دعوے دار ہوتا ہے۔ ''چالیس چراغ عشق کے '' سے تصوف کے حوالے سے یہ قربانیاں سامنے آئی ہیں جیسے مولانا روم اپنے محبوب شمس تبریز کے لیے اپنے گھر والوں، مریدوں اور حتیٰ کہ اپنی انا تک کو قربان کر کے شراب خانے بھی جاتے ہیں اور رقص تک بھی اہتمام کرتے ہیں۔ دوسری عشقیہ قربانی ایلا کی صورت میں سامنے آئی ہے ایلا اپنے محبوب اے عزیز ظہارا کے لیے اپنے خاوند، بچوں اور وطن کو قربان کر دیتی ہے۔ یہ تصوف ہی جو لاثانی محبت کے ذریعے پوری دنیا کو ایک دائرے میں پرو دیتا ہے۔

۷۔ جمیلہ ہاشمی نے حسین بن منصور حلاج کی تاریخ پیش کی ہے۔ ''دشتِ سوس ''میں جمیلہ ہاشمی نے حسین بن منصور حلاج کی پیدائش کے حالات سے لے موت تک واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ حسین بن منصور حلاج کے ہم عصر بزرگوں اور دینی رہنماؤں کے حالات بھی سامنے آتے ہیں۔ حسین بن منصور حالاج کی بچپن کی زندگی سے ہی کچھ ایسے واقعات سامنے آتے ہیں جو دوسرے بچوں سے مختلف اور غیر معمولی تھے جن میں سے ایک سہل عبد اللہ تستری کے مدرسے میں رہتے ہوئے ان کے رسائل کا مطالعہ اور پھر ان رسائل کے رموز کے بارے میں غور وخوص کرنا شامل ہے۔

۸۔ ایک صوفی ہمہ وقت حقیقت کے رازوں کا متلاشی ہوتا ہے۔ ''دشتِ سوس '' سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ حسین بن منصور حلاج نے اپنی ساری زندگی ان رازوں کی کھوج میں گزاری جو عام آدمی کے بس کی بات نہیں یا عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہوتے ہیں۔ حسین بن منصور حلاج نے مقدر اور دعا کے بارے میں عام آدمی سے زیادہ جان کر تصوف کے اس مقام پر جگہ پائی جہاں پر زمانہ ان کے مخالف ہو گیا۔

۹۔ حسین نے اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے خود کو خدا کی ذات میں مدغم کر دیا۔ ''دشتِ سوس ''میں جمیلہ ہاشمی نے اس بات کو ثابت کر دیا کہ حسین بن منصور حلاج کا مقصد تھا کہ وہ اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے خود کو خدا کی ذات

میں مدغم کر دے اور اس مقصد میں آخر کار کامیاب بھی ہوا۔ حسین بن منصور حلاج نے اپنے مقصد کے لیے اپنی ذات تک کو قربان کر دیا۔

سفارشات

۱۔ "چالیس چراغ عشق کے " کے ناول پر بعنوان "محبت انسانیت اور خدا کا تعلق کیا ہے " پر کام کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ ایلف شفق کے دیگروں ناولوں پر بھی تصوف، صوفی اور انسانیت کے تصور پر کام کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ "دشتِ سوس" کے اسلوب پر کام کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ ایلف شفق اور جمیلہ ہاشمی تاریخی ناول نگار کے عنوان سے بھی تقابلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

کتابیات:

بنیادی ماخذات

۱۔ ایلف شفق، چالیس چراغ عشق کے، جمہوری پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۱۷

۲۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس، سنگِ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۱ء

ثانوی ماخذات

۱۔ ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر، اقبال اور مسلکِ تصوف، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۷

۲۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی (مرتبہ)، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء

۳۔ اعجاز الحق قدوسی، اقبال کے محبوب صوفیہ، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۷۶ء

۴۔ القرآن، سورہ جمعہ، آیت ۲

۵۔ اے۔ جے آربری، صفیازم، کوسمو پبلیکیشنز، نیو دہلی، ۲۰۰۳

۶۔ آل احمد سرور، اقبال اور تصوف، لبرٹی آرٹ پریس، نئی دہلی، ۱۹۸۰

۷۔ بابا ذہین شاہ تاجی، کتابالطواسین لامنصور الحلاج، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۵

۸۔ سوزن بیسنٹ، ترجمہ توحید احمد، تقابلی ادب: ایک تنقیدی جائزہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

۹۔ شیخ فرید الدین عطار، حضرت، تصیح (مولانا اختر حجازی)، تذکرۃ الاولیاء، آر آر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۸ء

۱۰۔ شیخ حفیظ الرحمن، تصوف اور صوفیا کی تاریخ، شاکر پبلیکیشنز، لاہور

۱۱۔ شبلی نعمانی، مولانا، موازنہ انیس و دبیر، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۹۰۷

۱۲۔ شبلی نعمانی، مولانا، سوانح مولانا روم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۱ء

۱۳۔ شمس الدین عظیمی، خواجہ، تصوف، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاؤالدینذکریایونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۶

۱۴۔ شمس الدین عظیمی، خواجہ، احسان و تصوف، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاؤالدین ذکریایونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۶

۱۵۔ طارق محمود، راجہ، سوانح حیات شمسُ المعارف، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۲

۱۶ ارضا احمد، اردو ناول میں تصوف کی روایت، اورینٹل کالج جامعہ پنجاب، لاہور

۱۷۔ عبد المالک آروی، شمس و رومی (مرتبہ) زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۴، ص ۳۲

۱۸۔ غلام معین الدین نعیمی، مفتی، (مترجم)، کشف المحجوب، بابا پبلشرز اردو بازار، لاہور، س ن ص ۴۹۹۔۵۰۰

۱۹۔ فرخ سہیل گوئندی، (مقدمہ) چالیس چراغ عشق کے، جمہوری پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۱۷

۲۰۔ مشیر الحسن، پروفیسر اسلام اور عصرِ جدید، لبرٹی آرٹ پریس، دریا گنج نئی دہلی، دہلی، ۲۰۰۷ء

۲۱۔ محمد اکرام چغتائی، مولانا جلال الدین رومیؒ حیات و افکار، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء

۲۲۔ محمد حسین آزاد، آبِ حیات، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۱

۲۳۔ محمد مختار خان غزنوی، حقیقتِ تصوف، میاں خیل پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

مقالہ جات اردو

۱۔ روشین امجد، فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید کا نسائی تصور (تقابلی مطالعہ)، نمل، اسلام آباد، ۲۰۱۸

۲۔ ذوالقرنین عسکری، سید جمیلہ ہاشمی بحیثیت ناول نگار (مقالہ برائے ایم فل)، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، ۱۹۸۸ء

۳۔ محمد اسلم، جمیلہ ہاشمی کا افسانوی ادب (مقالہ برائے ایم فل)، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء

مقالہ جات انگریزی

Rumi in ۔۱Afreen Faiyaz,dr,Thou Shalt Love!:The Contemporary Relevance of ElifShafak,S The Forty Rules of love A character based...QasimUniversity,Saudi Arabia,2019

Billy Gray,Rumi,Sufi spirituality and teacher disciple relationship in Eli Shafak,s love,p125,https//doi.org/10.30674/scripta.84280۔۲The Forty Rules of

American ۔۳Tolba Mohamed Amine,The impact of Sufism on the contemporary Society in ElafShafak,s novel, The Forty rules of love,Larabi Bin M,hidiUniversity,Oum El bouagh,2016

رسائل و جرائد

۱۔ سید عابد حسین، اسلام اور عصر جدید (خصوصی شمارہ نذر رومی)، ذاکر حسین انسٹیا نسٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز، جامعہ ملیہ نئی دہلی، ۲۰۰۷ء

۲۔ مسز فاطمہ برہان سروری قادری، (مضمون) مشمولہ سُلطان الفقر، جلد ۱۵، جون ۲۰۲۱ء

۳۔ محمد خالد اختر، آتشِ رفتہ، ماہِ نو (مجلہ)، لاہور، اکتوبر ۱۹۸۸ء، ص ۱۸

اخبار

ا۔ حمیرا اطہر، جمیلہ ہاشمی سے ملاقات، اخبار خواتین (ہفت روزہ)، کراچی، ۷ تا ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۷ء

اردو لغات

ا۔ شان الحق حقی، فرہنگِ تلفظ، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء

۲۔ وقاص خان، اردو سے اردو آف لائن ڈکشنری اور اصطلاحات، س ن

انگریزی لغات

Collins Cobuild,AdvancedLearner,s English Dictionary,Harper Collins

Publishers Great Britain,2006,p-277 ۔ا

ویب سائٹس

www.merriam.webster.com/dictionary/comparative literature

www.wikipedia.org>wiki>comp